مولانا مودودیؒ کے ساتھ
میری رفاقت کی سرگزشت
اور اب میرا موقف
مولانا محمد منظور نعمانی
مقدمہ
مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔کے۔۳۔ ناظم آباد نمبر۱۔ کراچی ۱۸

آپ سے گذارش

جیسا کہ کتاب کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہو گا یہ خصوصیت سے
جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے حضرات ہی کے لیے لکھی گئی ہے
وہی اس کے اصل مخاطب ہیں —— امید ہے کہ انشاء اللہ اس
سے ان کو وہ روشنی ملے گی جس کی ان کو ضرورت ہے

لہٰذا

دلی خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایسے حضرات تک یہ پہنچ سکے
اس سلسلہ میں جو کچھ آپ کر سکتے ہوں اللہ کے دین اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی خدمت تصوّر کر کے اس سے
دریغ نہ کریں
اس حلقہ کے جن حضرات تک پہنچا سکتے ہوں پہنچائیں اور یہ کام
لِلّٰہ فی اللہ اور آخرت کے اجر ہی کی نیت سے کریں۔

اسی کتاب کی آخری سطریں

"جو حضرات مولانا مودودی اور "جماعت اسلامی" کے ساتھ اس عاجز کے تعلق سے واقف ہیں اُن کے علم میں ہو گا کہ "جماعت" سے قطع تعلق کے بعد بھی طویل مدت تک میرا حال اور رویہ یہ رہا کہ اُس زمانے میں مولانا مودودی پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے چونکہ میں ان کو اس وقت غلط فہمی پر مبنی سمجھتا تھا اس لیے ان کی طرف سے مدافعت اور جوابدہی کرتا تھا ـــــ جماعت سے قطع تعلق کے ۱۰ سال بعد ۱۳۷۰ھ کا واقعہ ہے بعض اہل علم کی طرف سے ایسی تحریریں شائع ہوئیں جن میں مودودی صاحب پر اعتراضات والزامات تھے تو اس عاجز نے ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ (اگست ۱۹۵۱ء) کے الفرقان میں مولانا موصوف کی طرف سے پوری جواب دہی کی تھی۔

لیکن اس کتاب میں راقم سطور نے اُن کی جن چند سنگین اور موجب فتنہ غلطیوں پر گفتگو کی ہے، میں اپنے امکان بھر غور و فکر کے بعد بھی ان کی کوئی تاویل و توجیہ نہیں کر سکا میں اپنے خدا کے سامنے عرض کر دوں گا کہ میں نے تیری کتاب اور تیرے دین کی روشنی میں ان غلطیوں کو زیغ و ضلال اور امت کے لیے موجب فتنہ ہی سمجھا تھا۔

اس لیے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ اپنا ما فی الضمیر آپ حضرات کے سامنے پیش کر دوں ـــــ اگرچہ جماعت کے مزاج سے واقفیت اور بار بار کے تجربوں کی بنا پر قریب بہ یقین اندازہ ہے کہ جماعت کے اہل قلم کی طرف سے اس کا جواب ہی دیا جائے گا۔ لیکن میں پیشگی عرض کرتا ہوں کہ جو کچھ اس عاجز نے لکھا ہے جواب در بحث کے لیے نہیں لکھا، اپنی عمر کے پیش نظر موت کا وقت قریب سمجھتے ہوئے "نصح دینی" اور "شہادت حق" کا فریضہ ادا کرنے اور "براءت ذمہ" ہی کی نیت سے لکھا ہے آگے معاملہ بس خدا کے سپرد ہے۔

فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ ۚ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝

پیش لفظ

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

امت کی دینی، علمی، فکری و اصلاحی طویل تاریخ میں دینی وعلمی احتساب، بے لاگ، بے رو رعایت اور تعمیری وصحت مند تنقید کی مثالوں کی کمی نہیں، بلکہ اس بارے میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ اس معاملہ میں کوئی قوم وملت، ملت اسلامیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اور یہ ہر طرح سے اس امت کے شایان شان ہے جس کو "شھداء علی الناس" کا امتیاز عطا کیا گیا ہے اور جس کو "یأیھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ" کے امر کا مخاطب بنایا گیا ہے، علمائے امت کو اپنے اس فریضہ کے ادا کرنے سے نہ کسی کا زہد، روحانیت، عند اللہ و عند الناس مقبولیت روک سکی نہ وہ عظیم دینی خدمات اور ملی منافع بلکہ فیوض و برکات مانع بن سکے جو ان کی ذات سے مسلمانوں اور اسلام کو پہونچ رہے تھے اس کی تابناک مثالیں جرح وتعدیل اور اسماء الرجال کی کتابوں، اور کتب طبقات وتراجم میں دیکھی جا سکتی ہیں، بلکہ مشہور اصول "زلۃ العالِم زلۃ العالَم" (عالِم کی لغزش عالَم کی لغزش ہے) کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن لوگوں کو متبوعیت ومقتدائیت کا مقام حاصل تھا یا جن کے قول وعمل کو حجت وسند سمجھا جاتا تھا،

ان پر تنقید و احتساب اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی میں ان ناقدین و مصلحین نے (اُن کی خدمات کے پورے اعتراف اور ان کی ذات کے کامل احترام کے ساتھ) اپنی ذمہ داری کا اور زیادہ احساس کیا اور دوسروں کے مقابلہ میں (جن کو امّت اور اسلامی معاشرہ میں یہ مقام حاصل نہیں تھا) اس کام کو اور زیادہ ضروری سمجھا۔

ہمارے علم اور محدود مطالعہ میں قرنِ اول سے لے کر اس موجودہ عہد تک کبھی یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا، اور اگر اس امت کے لیے اسلام کی صراطِ مستقیم پر قائم رہنے، کتابِ الٰہی کا تحریف سے اور امّت کا ضلالتِ عامہ سے محفوظ رہنے کا خدائی فیصلہ ہے (اور یہ اس امت کے لیے جو آخر الاُمم ہے ضروری ہے) تو یہ سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا، اور اس کو قائم رہنا بھی چاہیے کہ اس میں اس امت کی حفاظت اور انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ کے قیامت تک اس امت میں جاری رہنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع بھی دی ہے کتبِ حدیث میں آپ کا یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے۔ یحمل هذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاهلین[1] (مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم) اور امم سابقہ اپنے علماء اور دین کے علمبرداروں کی اسی اخلاقی جرأت اور فرض شناسی کی کمی، دین میں مداہنت اور پاسداری (محاباۃ) اور دینی مصالح پر دنیوی مصالح کی ترجیح، مسئلہ کو مادی، سیاسی اور تنظیمی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادت کی بنا پر عمومی ضلالت و انحراف کا شکار ہوئیں، اور آخر میں وہ آخری اور کمزور دھاگا بھی ٹوٹ

---

[1] اس ارشادِ نبوی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو علم (کتاب و سنت کی شکل میں) آیا ہے ہر زمانہ کے قابلِ اعتماد بندے اس امانت کی حفاظت کریں گے، غالیوں کی تحریفات، اہلِ باطل کے غلط دعووں اور جاہلانہ تاویلوں کی تردید اور ان کا غلط باطل ہونا ثابت کریں گے۔"

گیا جوان کو خدا سے اور اپنی کتاب و شریعت سے مربوط کیے ہوئے تھا۔

ہر دعوت و تحریک میں دو چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، ایک اس کا اساسی فکر جو اس کو دوسری دعوتوں اور تحریکوں سے ممتاز کرتا ہے اور وہی اس کی روح رواں ہوتی ہے، دوسرے داعی اول یا بانی تحریک کی شخصیت و سیرت، جہاں تک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے اس اساسی فکر کا تعلق ہے جس پر حقیقتاً جماعت اسلامی کی بنیاد پڑی، اور جس پر اس کی پوری عمارت قائم ہے اور بظاہر (جب تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آئے) قائم رہے گی، وہ ان کا وہ فکر یا خصوصی تحقیق ہے جو انھوں نے قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحوں" دین، عبادت، رب اور الٰہ" کی تشریح میں پیش کی ہے، اور جس کو" حاکمیت الٰہ اور سلطانیٔ رب" کے مختصر لفظوں سے ادا کیا جاسکتا ہے جو ان کے نزدیک پورے دین کا جوہر اور ان کی پوری تحریک کی اساس ہے، یہ اساسی فکر اور مولانا کی مخصوص تحقیق بہت دوررس نتائج کی حامل اور اس خاص نوعیت کی تھی کہ اس عہد کے ان علما کو جن کی کتاب و سنت سے براہ راست واقفیت اور امت کے اعتقادی و فکری تسلسل سے شناسائی ہے اس کا پوری اہمیت کے ساتھ نوٹس لینا چاہیئے تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ مولانا نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ" بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصل معانی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لیے خاص ہو گیا" اور یہ کہ" محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی"

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص۹)

لیکن کچھ تو دوسرے بعض مباحث کی طرف توجہ مبذول ہو جانے کی وجہ سے

اور کچھ اس طبقہ سے زیادہ واسطہ نہ پڑنے کی وجہ سے جس کا فکر و عمل اس فکری اساس اور اس مخصوص تحقیق کا پرور دہ بلکہ زائیدہ تھا، ان حضرات نے شائد اس کی پوری اہمیت محسوس نہیں کی اور ان سنگین نتائج کا اندازہ نہیں لگایا جو اس تشریح و تحقیق سے تعلق مع اللہ، اخبات و انابت الی اللہ، عبدیت اور ایک مسلمان کے فکر و عمل پر مرتب ہوتے ہیں، اور انھوں نے اس کو اپنے احتساب و تنقید کا مرکزی نقطہ قرار نہیں دیا۔

غرض ان خاص حالات و اسباب کی بنا پر اس اساسی فکر اور عصر حاضر میں دین کی اس جدید تفہیم و تشریح" کا اُس وقت جب وہ پیش کی گئی تھی اُس اہمیت کے ساتھ احتساب نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق تھی اور اس ضروری کام کی طرف بہت تاخیر سے توجہ کی گئی۔

اس سلسلہ کی ایک کڑی تو وہ ہے جو راقم سطور کے قلم سے کچھ عرصہ پہلے نکلی اور تقریباً اسی نام سے شائع ہوئی اور دوسری کڑی (بعض اضافوں اور چند دوسرے اہم مباحث کے ساتھ) رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے قلم سے اب نکل رہی ہے اور ناظرین کے سامنے ہے، یہ اس اساسی فکر کا قرآن مجید اور امت کے فہم قرآن اور اس کے عمل کے تسلسل کی روشنی میں ایک علمی جائزہ اور ایک ناقدانہ تبصرہ ہے،

اس سلسلہ میں حیرت کی بات صرف اتنی ہے کہ اس فکر (جس کی بنیاد ہی امت کے ایک بڑے طبقہ اور مسلسل و طویل صدیوں کے فہم دین اور فہم قرآن کی نفی پر تھی) کی تنقید کا استقبال بڑی ناگواری، استعجاب اور کسی قدر آزردگی کے ساتھ کیا گیا، جو ایک ایسی جماعت سے قطعاً غیر متوقع تھا جس کو اس کا دستور اساسی ہدایت کرتا ہے کہ "رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنایا جائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا جائے، اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہوا جائے" اس کے جواب میں

وہی کہا جاسکتا ہے جو راقم السطور نے کتاب کے عربی ترجمہ میں لکھا ہے کہ "عمل تنقید و احتساب پر سواریوں کی آمد و رفت کے بلدیاتی بے لچک قانون نافذ نہیں کیے جاسکتے" تنقید و احتساب کا عمل یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ اور اس کا حق ہر صاحب فکر و نظر کو حاصل ہے۔"

دوسری چیز جو کسی تحریک اور نئی دعوت کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ اس کے داعی اور بانی کی شخصیت و سیرت ہے، کم سے کم اسلامی دعوت اور اس کے احیاء و نشاۃ ثانیہ کی تحریکات اور کوششوں میں داعی کی سیرت کو اس کی دعوت اور فکر سے یہ کہکر علاحدہ نہیں کیا جاسکتا کہ "انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال" (دیکھو کیا کہا جا رہا ہے یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے) اس لیے کہ دعوت و داعی میں ایک ایسا نازک رشتہ ہے جس کا قرآن مجید تک نے انبیاء اور ان کی دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں لحاظ کیا ہے اور دعوت کے ساتھ جابجا داعیوں کے عمل و اخلاق کو پیش کیا ہے۔

اس سلسلہ میں کچھ کہنے اور لکھنے اور اپنے تاثرات و تجربات پیش کرنے کا استحقاق نہ صرف راقم السطور بلکہ جماعت اسلامی کے اکثر اور شائد تمام تر رفقاء کے مقابلہ میں اس کتاب کے مصنف مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کو حاصل تھا کہ اس وقت ہمارے علم میں "جماعت" کا ان سے زیادہ قدیم اور بنیادی رکن اس تحتی براعظم (ہند و پاک) میں کوئی دوسرا نہیں ۔ وہ جماعت کے بانیوں اور اولین ارکان اور داعیوں میں ہیں۔ ایک زمانہ میں وہ مولانا کے سب سے قریب رفیق اور سب سے بڑے معتمد و مشیر رہ چکے ہیں، اور عرصۂ دراز تک (جب تک کہ انھوں نے جماعت سے علاحدگی اختیار نہیں کی) وہ اس کی دعوت کے پرجوش وکیل و نقیب رہے ہیں۔ اس بارے میں انھوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ اور اپنے

حلقہ کے اکابر اور اپنے مکتب فکر کے رفقاء کی آزردگی اور ناپسندیدگی کا قطعاً لحاظ نہیں کیا'۔ جو لوگ مولانا کی مزاجی خصوصیات، ان کی احتیاط اور شہادت کی ذمہ داریوں کے احساس سے واقف ہیں وہ اس سے محض جماعتی اختلاف کا حوالہ دے کر صرف نظر نہیں کر سکتے، اور نہ یہ کہکر اس کی اہمیت کم کر سکتے ہیں کہ مولانا کی معلومات بالواسطہ یا سرسری ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور اس پر پوری سنجیدگی، کشادہ دلی اور کسی قدر جرأت و ہمت سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جماعت کے تقریباً تمام ان بنیادی ارکان نے یکے بعد دیگرے جماعت سے علاحدگی اختیار کر لی جن میں سے اکثر پہلے دن سے اس میں شریک تھے، وہ اس کے دستور کے واضعین اور ملک میں اس کا تعارف کرانے اور اس کے لیے سینہ سپر ہونے والوں میں پیش پیش تھے، وہ اپنے اپنے حلقوں سے (جو ان کو بہت عزیز تھے) کٹ کٹ کر جماعت کے دائرہ میں آئے تھے اور انھوں نے کسی "لومتہ لائم" کی پروا نہیں کی تھی، اور بانیٔ جماعت مولانا مودودی نے مختلف موقعوں پر نہ صرف ان پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا بلکہ ان کو مخالفین و معترضین کے سامنے بطور سند کے پیش کیا[1]

ہمیں اس کا پورا علم اور تجربہ ہے کہ جماعتوں اور تنظیموں کو یہ مرحلے پیش آتے ہیں، لوگ ان میں شامل ہو کر ان کا ساتھ چھوڑتے ہیں، ان کے مخالف بھی بن جاتے ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی کو جو ابتلاء پیش آیا اور اس سے اس کے بنیادی ارکان (بالخصوص ان لوگوں نے جن کو کتاب و سنت کا براہ راست علم حاصل تھا) جس تعداد میں اور جس تسلسل کے ساتھ علاحدگی اختیار کی جماعتوں کی تاریخ میں اسکی

---

[1] ناظرین کو اس کی تفصیل اسی کتاب کے آخری صفحات سے معلوم ہو جائے گی۔

نظیر بہت مشکل سے ملے گی، بلکہ شاید نہ مل سکے گی۔

ہم اس کے مقابلے میں دیکھتے ہیں کہ ماضی قریب کی عظیم ترین تحریک دعوت و عزیمت اور جہاد و سرفروشی یعنی حضرت سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین میں جو لوگ شامل ہوئے، اور جنھوں نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیا وہ آخری سانس تک ان کے ساتھ رہے انھوں نے کسی مرحلہ پر ان کا ساتھ نہیں چھوڑا، ان میں سے ایک تعداد شہادت سے سرخرو ہوئی اور "صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه" کا مصداق ثابت ہوئی۔ اور جن کی قسمت میں یہ شہادت نہیں تھی اور وہ شہادت گاہ بالاکوٹ سے زندہ بچ کر آئے وہ مجاہدین کے دوسرے مرکز میں منتقل ہو گئے یا اپنے وطن ہندوستان واپس آئے تو وہ بھی مرتے دم تک اسی دعوت و تحریک کا دم بھرتے رہے، اور سید صاحب کی محبت و عقیدت میں سرشار اور میدان کارزار کے لیے ہر وقت سرگرم اور تیار رہے "ومنهم من ينتظر وما بدّلوا تبديلا" یہ فرق ان سب لوگوں کو دعوت غور و فکر دیتا ہے جو دعوت و داعی کے نازک رشتہ سے واقف، انسانی نفسیات سے آشنا اور اسلام کی نشأت ثانیہ کے لیے کام کرنے والوں کے معیار مطلوب سے واقف ہیں۔

پیش نظر رسالہ ان دونوں حقیقتوں سے بحث کرتا ہے۔ اس میں مولانا مرحوم کی قابل قدر خدمات اور خصوصیات و کمالات کا فراخ دلی کے ساتھ، اور مصنف نے ان کا جو اثر قبول کیا ہے اس کا اخلاقی جرأت کے ساتھ اعتراف ہے۔ اور اس کی ایک خاص دائرہ میں افادیت کا بھی، پھر اس کے ساتھ قابل تنقید پہلوؤں کا دیانتداری اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اظہار بھی۔ امید ہے کہ وہ ٹھنڈے دل اور کھلے دماغ سے پڑھا جائے گا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔ کہ سپردگی اور راستہ اور منزل کے انتخاب

کا مسئلہ بڑی اہمیت اور نزاکت رکھتا ہے اور اس کے لیے بار بار غور کرنے اور جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اوراق کا مطالعہ اس سلسلہ میں مدد کرے گا۔

ابوالحسن علی

دیباچہ

مصنف کے قلم سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی ھدنا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدنا اللہ

والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ ومن والاہ

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے دراصل یہ ایک مضمون ہے جو اب سے ۸۔۹ مہینے پہلے گزشتہ شعبان میں ماہنامہ "الفرقان" میں اشاعت ہی کی نیت سے لکھا گیا تھا اور اس کے شوال و ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ (ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۹ء) کے مشترک شمارے میں اس کی اشاعت کا پروگرام تھا۔ رمضان المبارک کے شمارے میں اس کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ شوال ہی میں اس کی کتابت قریب قریب مکمل ہو چکی تھی، کاپیاں پریس جانے والی تھیں کہ ۲۰ شوال (۲۳ ستمبر) کو اچانک اطلاع ملی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جو امریکہ میں مقیم اپنے صاحبزادے کے پاس علاج ہی کے سلسلہ میں مقیم تھے وہیں رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس اطلاع کے بعد اس مضمون کی اشاعت اُس وقت مناسب نہیں سمجھی گئی اور شوال و ذیقعدہ کے اُس مشترک شمارے کو روک کر صرف شوال کا شمارہ تیار کر کے شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا جو وسط ذیقعدہ میں شائع ہو سکا —— اس میں راقم سطور نے مولانا مرحوم سے متعلق مفصل تعزیتی نوٹ بھی لکھا جس میں اُن کی قابل قدر خدمات، بعض خصوصیات اور اُن کے ساتھ اپنے ربط و تعلق اور پھر قطع تعلق کے مختلف ادوار کا تذکرہ کرنے کے بعد عرض کیا تھا کہ ان کے انتقال کر جانے کے بعد اب ہم پر ان کا حق یہی ہے کہ اُن کے اور اپنے رب کریم سے اُن کے لیے اور اپنے لیے بھی مغفرت و رحمت کی استدعا کریں۔ ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین اٰمنوا ربنا انک رؤف رحیم۔

پھر ذیقعدہ کا شمارہ بھی اسی طرح شائع کیا گیا جو ذی الحجہ میں شائع ہو سکا تھا۔
—— اس کے بعد ذی الحجہ و محرم (نومبر دسمبر) کے مشترکہ شمارے میں اس مضمون کا ایک حصہ شائع کیا گیا (اس کی تمہید میں ان اسباب و محرکات کا بھی ذکر کیا گیا تھا جن کی وجہ سے اس کے لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا تھا) باقی حصہ اس کے بعد کے دو شماروں میں شائع ہوا۔
اور اب وہی پورا مضمون رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پیش لفظ کے اضافے کے ساتھ اس کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے —— اللہ تعالیٰ اس کو اپنے بندوں کے لیے نافع بنائے۔

اس کا بیحد افسوس اور قلق ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی زندگی میں یہ مضمون شائع نہیں ہو سکا اور ان کے مطالعہ میں نہیں آ سکا، حالانکہ وہ اس کے ایک اہم حصے کے خاص مخاطب تھے اور جا بجا اس میں ان کو مخاطب کر کے ان کی خدمت میں کچھ عرض کیا گیا تھا اور اپنے قدیم تعلق کی بنا پر توقع تھی کہ وہ میری ان معروضات کو مخلصانہ سمجھ کر ان پر غور فرمائیں گے۔
لیکن ہوا وہ جو قضاء و قدر کا فیصلہ تھا۔ ما شاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن۔
اب جبکہ مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں تو ان معروضات کے خصوصی مخاطب اُن کے بجائے جماعت اسلامی کے عمائد اور عام اصحاب فہم و دانش ہیں۔
اس عاجز نے کتاب کے آخر میں "اضافہ" کے زیر عنوان ان حضرات کی خدمت میں کچھ عرض کیا ہے۔ میری استدعا ہے کہ یہ حضرات اس کو توجہ سے ملاحظہ فرمائیں —— باقی قلوب تو سب کے اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔

جیسا کہ ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے اس مضمون کے دو حصے ہیں ——
پہلے حصے میں راقم سطور نے مولانا مودودی صاحب کے ساتھ اپنے گہرے تعلق اور اپنی

رفاقت کی سرگزشت بیان کی ہے اور دوسرے حصے میں اُن کے بعض اُن افکار و نظریات پر گفتگو کی ہے جن کے متعلق اس عاجز کا احساس بلکہ یقین ہے کہ ان میں اُن سے سنگین غلطی ہوئی ہے اور امت کے لیے اور خاصکر اُن کے متبعین کے لیے زیغ وضلال کا سبب بن سکتے ہیں اور بجائے خود بھی دین میں فتنہ ہیں اور اُن سے چشم پوشی جائز نہیں —— ان میں متعدد غلطیاں وہ ہیں جن پر اب سے بہت پہلے الفرقان میں لکھا جا چکا ہے —— گزشتہ دنوں میں راقم سطور نے یہ محسوس کر کے کہ میری عمر کا بھی بظاہر یہ آخری دور ہے اور مولانا مودودی کی عمر مجھ سے بھی دو سال زیادہ ہے نصح دینی، عنداللہ براءت اور اتمام حجت ہی کی نیت سے ممکن حد تک وضاحت کے ساتھ اِن غلطیوں کے بارہ میں اپنی معروضات اس مضمون کی شکل میں مرتب کی تھیں، جو اب آپ اس کتاب کے صفحات میں پڑھیں گے۔ اس عاجز کا خیال ہے کہ مودودی صاحب کی ان سنگین غلطیوں کے بارہ میں جو کچھ جس طرح عرض کیا گیا ہے اُس کے سمجھنے کے لیے نہ بڑے گہرے علم کی ضرورت ہے نہ بہت وسیع مطالعہ کی، جس بندے کو بھی فہم سلیم نصیب ہے اور توفیق خداوندی رفیق، وہ انشاء اللہ ناچیز کی ان معروضات کو دو اور دو چار کی طرح سمجھ سکے گا۔ واللہ الموفق

مولانا مودودی صاحب کے ساتھ تعلق اور رفاقت کی یہ سرگزشت بھی ایک دفعہ اب سے ۲۲ سال پہلے ۱۳۷۰ھ (۱۹۵۱ء) میں الفرقان ہی میں لکھی جا چکی ہے لیکن وہ راقم سطور نے اس حال میں کہ مریض اور صاحب فراش تھا، سرسری طور پر املا کرائی تھی، نیز اس میں بعض خاص باتوں کی طرف صرف اشارہ کر دیا گیا تھا صراحت سے دانستہ گریز کیا گیا تھا۔ اس وقت جو سرگزشت اس کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے یہ اہتمام سے اس عاجز نے خود سپرد قلم کی ہے۔ اس میں بعض وہ

باتیں بھی آگئی ہیں جو پہلے لکھنے سے رہ گئی تھیں۔ اسی طرح جن باتوں کی صراحت سے گریز کیا گیا تھا، اب ضروری اور ایک درجہ میں اپنا فریضہ سمجھ کر ان کو صراحت کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔ اور مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ساتھ اس عاجز کے تعلق و رفاقت کا وہ پس منظر بھی سپرد قلم کیا گیا ہے جس کا تعلق "تحریک خلافت" اور میری طالب علمی کے دور سے ہے بلکہ سلسلۂ کلام اسی سے شروع کیا گیا ہے ——— اس طرح راقم سطور کی آپ بیتی کا ایک پورا باب تحریر میں آگیا ہے۔ جو ناظرین کے لیے انشاء اللہ سبق آموز بھی ہوگا اور دلچسپ بھی ———

اب ناظرین کرام اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں جس کا پہلا عنوان ——— "تحریک خلافت" ہے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

محمد منظور نعمانی لکھنؤ

۷ ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ

۲۵ فروری ۱۹۸۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریکِ خلافت اور اس کے اثرات

یورپ کی پہلی جنگِ عظیم جو ۱۹۱۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۸ء پر ختم ہوئی تھی، یاد ہے کہ اس کے خاتمہ تک ملک کی فضا ایسی تھی کہ عام آدمی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ یہاں انگریزوں کی حکومت نہیں رہے گی، یا اس کے خلاف کوئی تحریک ہی اٹھ سکے گی ــــ پھر اس جنگ ہی کے نتیجہ میں وہ حالات پیدا ہوئے جو ہندوستان میں "تحریکِ خلافت" برپا ہونے کا سبب بنے جس نے چند ہی مہینوں میں ہندوستان میں خاص کر ہندوستانی مسلمانوں میں وہ انقلاب برپا کر دیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ــــ خلافت کی تحریک اور آزادئ ہند کی تحریک دونوں ساتھ چل رہی تھیں، قیادت بھی دونوں کی مشترک تھی، مولانا محمد علی شوکت علی جس طرح تحریکِ خلافت کے قائد و علمبردار تھے اسی طرح تحریکِ آزادی کے بھی، اور گاندھی جی جس طرح تحریکِ آزادئ ہند کے لیڈر تھے اسی طرح تحریکِ خلافت کے بھی۔ پروگرام بھی دونوں تحریکوں کا ایک ہی تھا، جس کا اہم نکتہ تھا، انگریزی سرکار اور اس سے تعلق رکھنے والے اداروں سے عدم تعاون اور تا امکان انگریزی مصنوعات کا بھی بائیکاٹ ــــ ہندو اور مسلمان دونوں پورے اشتراک بلکہ اتحاد کے ساتھ تحریک چلا رہے تھے لیکن مسلمانوں کے جذباتی مزاج، بے پناہ جوش و خروش اور مسئلہ خلافت کی خاص مذہبی نوعیت نے تحریک پر اسلامی رنگ غالب کر دیا تھا، ــــ

اللہ اکبر' ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک نعرہ تھا، حد یہ تھی کہ بہت سے ہندو لیڈر جس طرح آزادیٔ ہند کے موضوع پر تقریر کرتے تھے اسی طرح خلافت کے مسئلہ پر بھی' (جو مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ تھا) بالکل مسلمانوں کے انداز میں (بلکہ ایک حد تک مولویانہ انداز میں) تقریریں کرتے تھے' ہمارے ضلع مرادآباد میں' میرے وطن سنبھل سے بالکل قریب' ایک چھوٹا سا قصبہ سرسی ہے وہاں کے ماسٹر چند ولال (جنہوں نے تحریک ہی کی وجہ سے اسکول کی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا تھا) بڑے اچھے مقرر تھے' ان کی تقریروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "اَخْرِجُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ"[1] بالکل صحیح الفاظ میں اور صحیح اعراب کے ساتھ اُن کی زبان سے بار بار سُننا اچھی طرح یاد ہے ـــــ الغرض اس وقت ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جو تحریک مشترکہ طور پر چل رہی تھی' اس پر اسلامی رنگ ایسا غالب تھا جس کا وہ لوگ تصوّر بھی نہیں کرسکتے جنھوں نے وہ منظر' اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

[یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑی کمی اور بڑی افسوسناک بات تھی کہ ایسی عظیم اور عدیم النظیر تحریک کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی تھی' اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے بزرگ خادمِ قوم وملت' اور مشہور صاحبِ قلم قاضی محمد عدیل عبّاسی (ایڈوکیٹ بستی) کو' انھوں نے ابھی حال میں جبکہ اس تحریک پر ساٹھ برس گزرنے والے ہیں بڑی محنت سے اس کی تاریخ مرتب

[1] یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وصیّت کے الفاظ ہیں' مطلب یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے باہر کردیا جائے' اس کے حدود میں ان کو رہنے بسنے کی اجازت نہ دی جائے ـــ خلافت کی تحریک جن بنیادوں پر برپا ہوئی تھی ان میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وصیت بھی تھی۔ تحریک خلافت کے سلسلہ کی تقریروں میں یہ حدیث اس کثرت سے دہرائی جاتی تھی کہ عوام بلکہ بہت سے ہندو بھائیوں کی زبان پر بھی چڑھ گئی تھی۔

ہی، وہ خود ان لوگوں میں ہیں جو تحریک کے میدان میں تھے اور اس زمانہ کی جیل کا عذاب بھی چکھا تھا، اگر اللہ نسان سے یہ کام نہ لے لیا ہوتا تو بظاہر یہ ضروری کام رہ ہی جاتا۔ بلاشبہ اپنے موضوع پر یہ اچھی اور قابل قدر تصنیف[1] ہے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بھی کوئی اُس فضا اور اس صورتِ حال کا اندازہ نہیں کر سکتا، جو تحریک خلافت نے اس ملک میں پیدا کر دی تھی۔]

جو دو تین سال "تحریکِ خلافت" کے خاص عروج و شباب کے تھے (تقریباً ۲۱-۲۲-۲۳ ۱۹ء) اُس زمانہ میں میرا قیام ایک طالب علم کی حیثیت سے ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مئو میں تھا، میرے خاص استاذ و مربی حضرت مولانا کریم بخش سنبھلیؒ (جن سے کچھ قرابت کا بھی تعلق تھا، مئو کی مشہور دینی درس گاہ "دار العلوم" میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے) مجھے تعلیم و تربیت کے لئے ان کے سپرد کر دیا گیا تھا، اس وجہ سے اس زمانہ میں میرا قیام مئو میں تھا ــــ یوں تو ملک کے سب ہی حلقوں میں تحریکِ خلافت کا زور شور تھا لیکن مئو کا جو حال تھا وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے بڑے یا چھوٹے شہر کا رہا ہو ــــ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو گئی ہے ــــ چونکہ تحریک کے پروگرام میں سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا، اس لئے خلافت کمیٹی نے اپنی عدالتیں بھی قائم کی تھیں۔ یاد آتا ہے کہ مئو کے معمر بزرگ شاہی جامع مسجد کے امام مولانا بشیر اللہ صاحب اور دار العلوم دیوبند کے فاضل مولانا محمد ضمیر صاحب اور مولانا عبد اللہ شائق مرحوم جو ایک

---

[1] یہ کتاب "ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی" نے شائع کی ہے، افسوس ہے کہ کتابت کی غلطیاں بے شمار ہیں، لیکن زیادہ تر ایسی ہیں کہ مطالعہ کرنے والے حضرات خود ہی تصحیح کر سکیں گے۔ کاغذ نہایت ہی اعلیٰ ہے اور طباعت آفسیٹ کی نہایت حسین ہے۔ قیمت صرف بارہ روپے ہے جو کاغذ اور طباعت کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے۔ ہر پڑھے لکھے کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

بہت نیز اور ذی استعداد اہلحدیث عالم تھے) اس عدالت کے قاضی (جج) تھے ہر قسم کے مقدمات اور نزاعات مسلمانوں کے بھی اور غیر مسلموں کے بھی اسی عدالت میں آتے تھے اور ان کے فیصلے کئے جاتے تھے اور فریقین بلا چون وچرا ان فیصلوں کو مانتے تھے مسلمانوں میں بعض آوارہ مزاج لوگ تاڑی پیتے تھے (جو ایک طرح کی شراب ہے) خلافت کے رضاکار جو پولیس والی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ ان کو پکڑ لانے اور عدالت کے حکم سے ان کے کوڑے لگائے جانے اور کوئی سرکشی اور سرتابی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ مئو میں سرکاری تھانہ اور اس طرح کے دوسرے سرکاری ادارے اور محکمے موجود تھے لیکن اس عرصہ میں ان لوگوں کے لئے گویا کوئی کام نہیں تھا۔ عوام کے اخلاق و کردار پر بھی غیر معمولی اثر پڑا تھا۔ جرائم اور لڑائی جھگڑے بڑی حد تک ختم ہو گئے تھے، کم از کم مئو کا تو یہی حال تھا کہ وہ حقیقی معنی میں دار الامن بلکہ ایک طرح کا "دار الاسلام" بن گیا تھا۔

یہ فضا جیسا کہ عرض کیا گیا تقریباً دو تین سال قائم رہی، اس کے بعد جب سنہ ۱۹۲۳ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے الغاءِ خلافت کا فیصلہ کر دیا تو تحریک کی بنیاد ہی ختم ہو گئی۔ اسی زمانے میں ملک میں بھی کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جن کے نتیجہ میں اس فضا کا خاتمہ ہو گیا، لیکن اس "تحریکِ خلافت" نے بعض بہت غیر معمولی اثرات چھوڑے، ان میں سے ایک یہ کہ عوام تک کے قلوب میں انگریزی حکومت کی مخالفت بلکہ دشمنی رچ بس گئی اور اس کا خوف دلوں سے بالکل نکل گیا۔ اور ہم جیسے لوگ بھی "اپنی حکومت" اور کم از کم اس فضا کا خواب دیکھنے لگے جو تحریک خلافت میں قائم ہو گئی تھی اور راقم سطور نے مئو میں دیکھی تھی۔

> **دار العلوم دیوبند کی طالب علمی اور اس کے بعد جمعیۃ العلماء سے وابستگی**

جیسا کہ اوپر عرض کیا، یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا اس کے بعد تعلیم کے آخری دور میں دو سال میرا قیام دار العلوم دیوبند رہا، (اور غالباً یہی

کہ یہ اب سے قریباً ۶۰ سال پہلے کا "دارالعلوم دیوبند" تھا، جب کہ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پر ۳/۴ سال ہی گزرے تھے۔ تحریک خلافت نے جو جذبات پیدا کئے تھے یہاں کی فضا نے ان کی آبیاری کی اور ان کو اور مشتعل اور مستحکم کیا۔ "خلافت تحریک" ختم ہو چکی تھی، ان جذبات کو کسی درجہ میں غذا دینے والی مسلمانوں کی جماعت "جمعیۃ العلماء ہند" ہی میدان میں رہ گئی تھی اور "دارالعلوم" میں تعلیم پائے ہوئے ہم جیسے لوگ اپنے اکابر کے تعلق سے اس کو اپنی جماعت سمجھتے اور اس سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے ــــ راقم سطور کی بھی اسی سے وابستگی رہی۔

اُس وقت کی جمعیۃ العلماء

اس وقت وہ حقیقی معنی میں جمعیۃ العلماء تھی یعنی صرف علماء ہی اس کے ارکان اور عہدہ دار ہو سکتے تھے سیاسی پارٹیوں کی طرح کی عام ممبر سازی اور الیکشن کا طریقہ اس وقت تک نہیں اپنایا گیا تھا۔

اگرچہ ہماری جماعت دیوبند کے علاوہ دوسرے طبقوں اور حلقوں کے علمائے کرام، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، حضرات علماء اہلحدیث، علماء فرنگی محل، علماء بدایوں مولانا آزاد سبحانی، مولانا نثار احمد کانپوری، مولانا فاخر الہ آبادی (مولانا احمد رضا خاں صاحب[1] بریلوی کے خلفاء میں سے) مولانا مختار احمد میرٹھی۔ ان کے بھائی مولانا نذیر احمد خجندی مولانا عبد العلیم میرٹھی (پاکستان کے مولانا نورانی میاں کے والد ماجد مرحوم) وغیرہ بھی اس وقت اچھی خاصی تعداد میں "جمعیۃ" میں شامل تھے اور وہ حضرات جمعیۃ کے ذمہ دارانہ عہدوں پر تھے لیکن ارکان اور کارکنوں میں غالب اکثریت جماعت دیوبند ہی کے علماء کی تھی ــــ اسی دور کا یہ لطیفہ مشہور ہے کہ کسی موقع پر مولانا عبد الماجد بدایونی

[1] مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی، تحریک خلافت کے سخت مخالف تھے انھوں نے اس سلسلہ میں حسب عادت متعدد رسالے بھی لکھے تھے لیکن مولانا مختار احمد میرٹھی وغیرہ ان کے بعض خلفاء نے اس مسئلہ میں اُن سے گویا بغاوت کر دی تھی۔ نعمانی

مرحوم نے (جو مسلکاً بدایونی حنفی تھے) مولانا ابو الکلام آزاد سے (جو سلفی المسلک تھے) بطور شکایت کے کہا کہ ہماری "جمعیۃ" کا نام تو "جمعیۃ العلمائے ہند" ہے لیکن واقعہ میں یہ جمعیۃ العلمائے دیوبند بنتی جارہی ہے۔ تو مولانا آزاد نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ میرے بھائی! ہندوستان میں جب بھی جمعیۃ العلماء بنے گی تو اس کی ہیئت ترکیبی یہی ہوگی، کیونکہ علماء تیار کرنے کا کام یہاں دیوبند ہی نے کیا ہے تو جب علما کو جمع کیا جائے گا تو انھیں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ اگر ہم نے، آپ نے یہ کام کیا ہوتا تو ہماری تعداد زیادہ ہوتی۔

آزادی کی جد وجہد میں کانگرس کے ساتھ اشتراکِ عمل

ملک کی آزادی کی جد وجہد میں "انڈین نیشنل کانگرس" کے ساتھ اشتراکِ عمل کا جو اصول تحریکِ خلافت کے دور میں اپنایا گیا تھا "جمعیۃ العلماء" بعد میں بھی اس پر برابر قائم رہی۔ اور آزادی حاصل کرنے کے لئے اس نے اس کو ضروری اور ناگزیر سمجھا لیکن

آزادی کے بارے میں جمعیۃ کا خاص تصور

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ ملک کی آزادی کے بارے میں "جمعیۃ العلماء" کا ایک خاص تصور تھا جو اس دور کے "جمعیۃ" کے اجلاسوں کے خطباتِ صدارت کے اوراق میں محفوظ ہے اور آج بھی دیکھا جا سکتا ہے (خاص کر حضرت مولانا محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار کے اجلاس مراد آباد کے خطبۂ صدارت میں اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے اجلاس کلکتہ کے خطبۂ صدارت، اور حضرت مولانا محمد انور شاہؒ کے اجلاسِ پشاور کے خطبۂ صدارت میں) اور جمعیۃ کے اجلاسوں کی تجاویز میں ــــ مجھے یاد ہے کہ اُس زمانہ کے جمعیۃ العلمائے کے دستور میں **مقصد و نصب العین** کے تحت غالباً پہلی ہی دفعہ کے الفاظ یہ تھے "**شرعی نصب العین کے مطابق**

ہندوستان کی مکمّل آزادی،

بہرحال ملک کی آزادی کے بارے میں جمعیتہ العلماء کا ایک خاص تصوّر تھا، اور اسی تصوّر کی بنا پر اس کے اکابرو رہنما آزادی کی جدّوجہد کو اپنے لئے جہاد فی سبیل اللہ سمجھتے تھے اور اسی نیت سے اس کے راستہ میں قربانیاں دیتے تھے۔

شدھی سنگٹھن کی تحریک کا دور،

تحریک خلافت کے اضمحلال اور پھر خاتمہ کے بعد کئی برس تک بعض ایسے اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، انگریزی حکومت کے خلاف جدّوجہد کا محاذ ٹھنڈا رہا تھا۔ اُس زمانہ میں آریہ سماجیوں کی اٹھائی ہوئی شدھی سنگٹھن تحریک کے نتیجہ میں ہندو مسلم اتحاد بھی درہم برہم ہوگیا اور دین کی فکر رکھنے والے مسلمانوں کو دین کی حفاظت کے لئے اس تحریک کے جوابی اقدامات کی طرف متوجہ ہونا پڑا، اس دور میں جمعیتہ العلماء کی بھی مساعی زیادہ تر اسی شعبہ کی طرف مصروف رہیں۔ اسی زمانہ میں "جمعیتہ العلماء" نے اپنا اخبار "الجمعیتہ" نکالنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا مودودی اس کے اڈیٹر تھے اور وہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ یہ عاجز سب سے پہلے "الجمعیتہ" ہی کے ذریعہ ان کے نام سے آشنا ہوا۔۔۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اس زمانہ میں انگریزی حکومت کے خلاف جدّوجہد کا محاذ ٹھنڈا تھا، کانگرس کی طرف سے بھی کوئی تحریک جاری نہیں تھی۔

۱۹۳۰ء سے جنگ آزادی کا پھر آغاز

۱۹۳۰ء میں کانگرس نے انگریزی حکومت کے خلاف پھر آزادی کی جنگ شروع کی۔ جمعیتہ العلماء نے بھی اپنے امروہہ کے اجلاس میں اس جنگ میں کانگرس کے ساتھ اشتراک عمل کا فیصلہ کیا اور وہ پھر کانگرس کے ساتھ جنگ کے میدان میں آگئی۔

اس دور میں میرا حال اور مشاغل

عرض کیا جا چکا ہے کہ راقم سطور بھی جمعیتہ العلمائے سے

والبستہ تھا۔ میری یہ وابستگی اگرچہ ذہنی اور فکری لحاظ سے بہت عمیق اور راسخ تھی اور میں ملک کی آزادی کے سلسلہ میں اس کی جد و جہد اور قربانیوں کو پورے یقین و اطمینان کے ساتھ "فی سبیل اللہ" ہی جانتا اور سمجھتا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کی اس سیاسی جدّو جہد میں میرا عملی حصہ بس برائے نام ہی رہا ــــ اس دَور میں تعلیم و تدریس میرا خاص مشغلہ تھا، اس کے علاوہ آریہ سماجیوں کی برپا کی ہوئی "شدھی" کی تحریک نے (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) اس زمانہ میں آریہ سماج اور مسلمانوں کے درمیان مناظرہ، مباحثہ کا میدان گرم کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میدان میں اسلام کی وکالت و حمایت کی کچھ صلاحیت عطا فرمائی تھی اس لئے میں اس میں بھی حصّہ لیتا تھا ــ قادیانی فتنہ اور قادیانی مبلغین کی سرگرمیاں بھی اس زمانہ میں عروج پر تھیں، اللہ تعالےٰ نے ان کے مقابلے اور ان کے فتنہ سے امت کی حفاظت کی خدمت کی توفیق بھی اس عاجز کو عطا فرمائی تھی۔

نیز قریبًا اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نجد کی "وہابی حکومت" کے اس وقت کے فرمانروا سلطان عبد العزیز بن سعود نے، شریف حسین کو (جس نے جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کی مدد سے سلطنت عثمانیہ ترکی اور خلیفۃ المسلمین سے بغاوت کرکے حجاز مقدس پر اپنی حکومت قائم کرلی تھی) حرمین شریفین اور پورے علاقۂ حجاز سے بے دخل کرکے وہاں اپنا اقتدار قائم کرلیا اور اپنے مسلک کے مطابق حکومتی طاقت سے وہاں دینی اصلاحات نافذ کیں، اس سلسلہ میں انھوں نے وہ قبّے بھی تڑوا ڈالے جو مکہ مکرمہ کے قبرستان "جنّۃ المعلاۃ" اور مدینہ منورہ کی جنّۃ البقیع میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے) بعض اہل بیت اور صحابۂ کرام کی قبور پر کسی زمانہ میں بنالئے گئے تھے۔ اس واقعہ پر ہندوستان کے مختلف طبقوں کے قبوریین و مبتدعین اور شیعہ حضرات نے متحدہ محاذ بناکر "وہابیوں" اور "وہابیت" کے

خلاف زبان و قلم کی ایک طوفانی جنگ برپا کردی اور یہاں حملوں کا خاص نشانہ شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کی دعوتِ توحید و سنت کی علمبردار جماعتِ دیوبند کے اکابر کو بنایا گیا اور تکفیر و تفریق اور فساد انگیزی کا وہ فتنہ جو مولانا احمد رضا خان بریلوی نے برپا کیا تھا اور جو تحریک خلافت میں بالکل دفن ہو گیا تھا پھر زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس میدان میں بھی یہاں مناظروں، مباحثوں کا بازار گرم ہو گیا۔ راقم سطور نے اللہ کی توفیق سے اس میدان میں بھی مسلک حق و اہل حق کی حمایت و وکالت میں حصّہ لیا ـــــ الغرض ایک طویل زمانہ تک تعلیم و تدریس کے ساتھ اسلام کی وکالت اور دین حق و اہل حق پر ہونے والے حملوں کی مدافعت بھی اس عاجز کا خاص مشغلہ رہا۔ اللہ تعالےٰ اپنے کرم سے اس کو بھی قبول فرمائے اور اس سلسلہ کی تقصیرات معاف فرمادے۔

مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن کا آغاز

غالباً ۱۹۳۲ء شروع ہو چکا تھا حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی نے ایک ادارہ لکھنؤ میں دارالمبلغین کے نام سے قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ "دارالعلوم دیوبند" جیسے بڑے دینی مدارس کے باصلاحیت فارغ التحصیل فضلا کو وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی دعوت و تبلیغ اور بیرونی حملوں اور اندرونی فتنوں سے اس کی حفاظت و مدافعت اور اس کے لئے تحریر و تقریر اور مناظرہ مباحثہ کی تربیت دی جائے ـــ مولانا مرحوم نے اس ادارہ کی خدمت کے لئے اس عاجز کو بھی طلب فرمایا اور اسی سلسلہ میں اس دور میں چند مہینے میرا قیام لکھنؤ میں رہا۔ اس وقت مولانا کا ماہنامہ "النجم لکھنؤ" جاری تھا اس کے دفتر میں حیدرآباد سے ایک نیا رسالہ "ترجمان القرآن" آنا شروع ہوا، جس پر ایڈیٹر کی حیثیت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

کا نام ہوتا تھا[1]۔ مولانا لکھنوی مرحوم کے صاحبزادے مولوی عبد المومن فاروقی مرحوم نے جو خود نوجوان صاحب قلم تھے، اس کا ایک شمارہ دیکھنے کے لئے مجھے دیا، میں نے محسوس کیا کہ اس کے ایڈیٹر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو اللہ تعالیٰ نے دینی مسائل و حقائق کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق سمجھانے کی غیر معمولی صلاحیت اور قدرت عطا فرمائی ہے، اور اسلام کے بارہ میں مستشرقین کی کتابوں اور مغربی علوم و افکار کے پیدا کئے ہوئے شکوک و شبہات جڑ سے اکھاڑ کے دلوں میں اطمینان و یقین پیدا کرنے میں ان کو خاص کمال حاصل ہے۔ اس کے بعد سے میں "ترجمان القرآن" کے ہر شمارہ کا منتظر رہنے لگا، جب وہ آتا تو مولوی عبد المومن مرحوم مجھے پہنچاتے اور میں بڑے شوق اور اہتمام سے اس کا مطالعہ کرتا۔

بریلی سے الفرقان کا اجرا

لکھنؤ میں اپنے قیام ہی کے زمانہ میں، میں نے "الفرقان" جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور محرم ۱۳۵۴ھ (مارچ ۱۹۳۶ء) سے بریلی سے اس کا اجرا ہوا۔ اور اب "ترجمان القرآن" اس کے تبادلہ میں میرے پاس براہ راست آنے لگا، وہ مجھے اتنا عزیز تھا اور میں اس کا ایسا عاشق تھا کہ اس سے پہلے پورے ایک سال کے شمارے جو میں نے لکھنؤ میں دیکھے تھے اور اب میرے پاس نہیں تھے وہ بھی میں نے دفتر ترجمان القرآن

---

[1] رسالہ "ترجمان القرآن" دراصل ایک دوسرے صاحب نے جاری کیا تھا جن کا نام غالباً ابو محمد مصلح تھا جس طرح عبد المجید قریشی صاحب نے لاہور سے "تحریک سیرت" چلائی تھی اسی طرح قریباً اسی زمانہ میں ان ابو محمد مصلح صاحب نے حیدرآباد سے "تحریک قرآن" شروع کی تھی اور اس کے آرگن کے طور پر "ترجمان القرآن" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا وہی اس کے بانی اور ایڈیٹر تھے لیکن وہ اسکو کامیابی سے نہیں چلا سکے تو کسی معاملہ اور معاہدہ کے تحت اس کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ان سے لے لیا تھا جو اس زمانہ میں حیدرآباد ہی میں رہتے تھے، ان کی ادارت میں ترجمان القرآن محرم ۱۳۵۲ھ سے نکلنا شروع ہوا تھا۔

حیدر آباد سے بقیمت منگوالئے اور اس کا پورا فائل اپنے پاس رکھنا ضروری سمجھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ترجمان القرآن کے مطالعہ سے میرے قلب میں مولانا مودودی کی وقعت اور محبت میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ میں اس دور میں "متکلم اسلام" لکھتا تھا اور نجی طور پر بھی اور "الفرقان" کے ذریعہ بھی "ترجمان القرآن" کے مطالعہ اور خریداری کی لوگوں کو ترغیب و دعوت دیتا تھا۔

ترجمان القرآن خالص علمی و دینی رسالہ

اس وقت "ترجمان القرآن" خالص دینی اور علمی رسالہ تھا جس میں ملک کی سیاسی تحریکات اور پولیٹیکل معاملات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا، برطانوی حکومت جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی "طاغوتی حکومت" تھی اور ہندوستان پر اور عالم اسلام کے بہت بڑے حصہ پر براہ راست یا بالواسطہ مسلط تھی اس کے خلاف بھی کبھی کچھ نہیں لکھا جاتا تھا "حکومت الہیہ"، "اقامت دین"، "اسلامی نظام"، یا ان مقاصد کے لئے کسی جماعت کی تنظیم و تشکیل کا بھی کوئی ذکر اس کے صفحات میں نہیں ہوتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس دور میں اُس کے دائرہ بحث سے بالکل خارج تھیں

ترجمان القرآن میں سیاسی مضامین کا آغاز

"ترجمان القرآن" کے اجرا کے چوتھے سال ۱۹۳۶ء میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیاد پر ہندوستان میں پہلا جنرل الیکشن ہوا۔ اُس دور میں جداگانہ انتخاب کا طریقہ رائج تھا، مسلمان نمائندوں کو مسلمان ہی منتخب کرتے تھے اور ہندو نمائندوں کو صرف ہندو۔ اس الیکشن کے نتیجہ میں ملک کے سات صوبوں میں کانگریس کو قطعی اکثریت حاصل ہوگئی، اور ان صوبوں میں بلا شرکت غیرے کانگریسی گورنمنٹیں قائم ہوگئیں۔ ان سات صوبوں میں غالب مسلم اکثریت کا ایک صوبہ سرحد بھی تھا۔ دوسرے صوبوں میں بعض دوسری مقامی سیاسی پارٹیوں کی مشترکہ گورنمنٹیں بن گئیں۔ یہ صوبائی گورنمنٹیں قانونی حیثیت سے

زیر سایہ برطانیہ ہونے کے باوجود بڑی حد تک خود مختار نہیں۔
اس مرحلہ پر ہم جیسوں کے لئے دو حقیقتیں کھل کر بالکل سامنے آگئیں۔ ایک یہ کہ انگریزی اقتدار سے ملک کے بالکل آزاد ہو جانے کی منزل اب زیادہ دور نہیں ہے — دوسرے یہ کہ انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت میں آزادی کی تحریک جس طرح چل رہی ہے، اس کے نتیجے میں جو آزادی حاصل ہوگی اور جو جمہوری قومی حکومت قائم ہوگی وہ ہم مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق نہ ہوگی بلکہ خاص کر اقلیتی صوبوں میں ان کی تہذیب اور ان کے ملی تشخص کے لئے نئے نئے خطرات پیدا ہو جائیں گے —

۱۹۳۶ء کے الیکشن کے بعد ملکی سیاست پر مولانا مودودی کے مضامین

مولانا مودودی نے اس وقت ترجمان القرآن میں اس موضوع پر لکھنا شروع کیا، یہ واقعہ ہے کہ وہ قلم کے بادشاہ ہیں، ان کے یہ مضامین قوت استدلال کے لحاظ سے بہت ہی محکم اور بڑے موثر تھے، راقم سطور بھی ان سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا، دوسرے بہت سے اخبارات و جرائد نے بھی ان کو اپنے صفحات میں شائع کیا یہاں تک کہ جمعیۃ العلماء کے اخبار "الجمعیۃ" میں بھی اس کی پہلی دو یا تین قسطیں شائع ہوئیں (حالانکہ ان کی زد اس وقت کے جمعیۃ کے سیاسی مسلک پر پڑتی تھی) "الفرقان" میں بھی یہ مضامین نقل ہوتے رہے اور راقم الحروف خود بھی ان کی تائید میں برابر لکھتا رہا۔

مولانا مودودی سے ذاتی ربط و تعلق

اسی زمانہ میں مولانا مودودی صاحب سے تعلقات بڑھے اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا اسی سلسلۂ مضامین میں ایک مرحلہ پر مولانا مودودی نے مسلمانوں کے سامنے احیاءِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کو نصب العین بنا کر خالص دینی بنیاد پر اس طرح کی ایک جماعت کی تنظیم اور اصلاحی دعوتی کام کی اسکیم پیش کی جس طرح

کسی دَور میں مولانا آزاد مرحوم نے "الہلال" کے ذریعہ "حزب اللہ" کے نام سے ایک جماعت کی تنظیم شروع کی تھی ۔ مجھے یاد آتا ہے کہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں حوالہ کے ساتھ "الہلال" کے اقتباسات بھی نقل کئے تھے ۔ اِس عاجز کو ان کی اس مثبت اسکیم سے بھی اس وقت پورا اتفاق تھا۔

پھر ایک مرحلہ آیا جب ہمارے درمیان خط وکتابت سے یہ طے ہوا کہ "ترجمان القرآن" اور "الفرقان" کے ذریعہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں مسلمانوں سے جو کچھ کہا جارہا ہے اور جو دعوت دی جارہی ہے، اس کو ایک تحریک بناکر آگے بڑھانے کے لئے عملی جدوجہد کا کوئی لائحہ اور منصوبہ بنایا جائے ۔ مولانا مودودی نے مجھے ایک خط میں لکھا کہ اب میں اس کا عزم کرچکا ہوں اور چونکہ اس کام کے لئے ریاستی علاقہ (حیدرآباد) بالکل مناسب نہیں ہے اس لئے میں پنجاب کے ایک مقام کو اپنی سکونت اور اس کام کے مرکز کے لئے تجویز کرچکا ہوں، اور وہاں منتقل ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہوں ۔ پھر ایک وقت انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ میں فلاں تاریخ کو دہلی پہنچ رہا ہوں، میرا قیام محلہ چوڑی والان "شمسی کاٹیج" میں ہوگا (یہ مولانا کا سسرالی مکان تھا) آپ اس تاریخ پر دہلی آجائیں تو آئندہ کام کے بارے میں تفصیلی باتیں ہوجائیں گی ۔

مودودی صاحب سے پہلی ملاقات

ابھی تک ہمارا تعلق غائبانہ تھا، ملاقات کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی، میں نے ان سے ملاقات اور مستقبل کے منصوبے اور کام کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے دہلی کا سفر کیا ۔ میں یہ بات سن چکا تھا کہ مولانا مودودی صاحب کے ایمان افروز مضامین سے ان کے طرزِ زندگی کے بارے میں جو اندازہ کوئی لگا سکتا ہے ان کی زندگی اُس سے بہت مختلف ہے یعنی جس اسلامی زندگی کے وہ پرزور داعی ہیں خود ان کی وہ زندگی نہیں ہے، جن صاحب نے

مجھے یہ بات بتلائی تھی وہ مولانا کے ملنے والوں میں سے تھے اور ترجمان القرآن کے مضامین سے متاثر، اور ان کے قدرداں تھے، انھوں نے بتلایا تھا کہ مودودی صاحب "محلوق اللحیہ" رہتے ہیں — مجھے یاد ہے کہ یہ سن کر مجھے حیرت و استعجاب کے ساتھ بڑا رنج و افسوس اور بڑی مایوسی ہوئی تھی[1] — لیکن دہلی کی اس ملاقات سے چند ہی روز پہلے حیدرآباد ہی سے ایک بڑے قابل اعتماد ذریعہ سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب اُن کی زندگی کے طرز میں ہم جیسوں کے لئے خوشگوار تبدیلی شروع ہو گئی ہے (ایک محترم بزرگ نے لکھا تھا کہ آپ مودودی صاحب کے چہرہ پر ایمان کی کھیتی اُگنا شروع ہو گئی ہے) مجھے اس اطلاع سے بڑی خوشی ہوئی تھی، بہرحال میں مولانا سے ملنے کے لئے دہلی پہنچا۔ چوڑی والان میں شمسی کالج پہنچ کر ملاقات کی — واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پہلی دفعہ مولانا کو دیکھ کر طبیعت کو ایک دھچکا سا لگا، کیونکہ اب بھی مولانا کی ہیئت اس سے بہت مختلف تھی جو ہونی چاہیئے تھی اور جس کی توقع پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت محلوق اللحیہ تو نہیں تھے لیکن اس لحاظ سے ان میں بس برائے نام ہی تبدیلی آئی تھی۔ مگر چونکہ مولانا کے مضامین سے میں بہت متاثر تھا اور ان کے ساتھ ایک خاص قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا اس لئے دل کو سمجھایا کہ عملی زندگی کی اصلاح کا ابھی آغاز ہوا ہے انشاء اللہ آئندہ یہ حالت نہیں رہے گی اور ان کی زندگی اور تحریر میں جو مطابقت ہونی چاہیئے وہ انشاء اللہ ہو جائے گی — آئندہ کام کے بارے میں اس ملاقات میں کسی قدر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

---

[1] جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کا ہے جب کہ ترجمان القرآن میں ۴/۵ برس سے مولانا کے وہ ایمان افروز مضامین شائع ہو رہے تھے جنھوں نے ہم جیسوں کو ان کا گرویدہ و عاشق بنا دیا تھا، اور میرا تصور ان کے بارے میں وہی تھا جو دین کے کسی داعی کے بارے میں ہونا چاہیئے۔

مولانا مودودی کی حیدرآباد سے پنجاب منتقلی

اس کے کئی مہینے بعد وہ وقت آیا جب مولانا حیدرآباد سے منتقل ہو کر پٹھان کوٹ کے قریب "دارالاسلام" نامی اُس نو تعمیر بستی میں آ گئے جس کو وہاں کے ایک مخلص صاحب خیر چودھری نیاز علی خاں صاحب نے اسی نیت سے بنایا اور وقف کیا تھا کہ اللہ کے کچھ بندے یہاں قیام کر کے دین کی کوئی ٹھوس خدمت انجام دیں۔[1]

---

[1] دارالاسلام اور اس کے بانی چودھری نیاز علی خاں مرحوم

یہ دارالاسلام کوئی بسی بسائی بستی اور آبادی نہیں تھی، اس کی حقیقت بس یہ تھی کہ پٹھان کوٹ (ضلع گورداسپور) کے قریب ایک بہت مختصر سی بستی" جمالپور" کے رہنے والے چودھری نیاز علی خاں اور ان کے بھائی چودھری عبدالرحمٰن خاں نے (جو دونوں بہت نیک دل اور باتوفیق تھے، اور اللہ تعالیٰ نے دنیوی دولت سے بھی خوب نوازا تھا، ہمارے اکابر میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ سے عقیدت و نیازمندی کا خاص تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے) جمالپور کے قریب ہی اپنی جائداد کا ایک وسیع قطعہ وقف کر کے اس میں دو رہائشی مکانات اور چند کوارٹر اور ایک مسجد بنوا دی تھی اور اس سب کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا اور چاہتے تھے کہ یہاں کوئی اچھا دینی کام ہو۔ مکانات اور مسجد کے اس مجموعہ ہی کا نام "دارالاسلام" تھا۔ چودھری نیاز علی خاں صاحب "ترجمان القرآن" کے مطالعہ ہی سے اس عاجز ہی کی طرح مولانا مودودی صاحب کی تحریروں سے متاثر اور ان کے قدردان تھے اور اسی کے ذریعہ وہ ان سے واقف ہوئے تھے۔ انھوں نے مودودی صاحب کو حیدرآباد سے وہاں آ کر قیام کرنے، اور وہیں سے کام کرنے کی دعوت دی تھی، اس میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے مشورہ کو بھی خاص دخل تھا۔

دارالاسلام کے بانی چودھری نیاز علی خاں صاحب کا جب ذکر آ گیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اللہ کے اس مخلص بندے کا کچھ مزید تعارف کرا دیا جائے۔ چودھری صاحب ایک بڑے زمیندار ہونے کے علاوہ ریٹائرڈ ایک بڑے سرکاری افسر بھی تھے، ان کے دل میں دین کی خدمت کی سچی تڑپ تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد جب پورے مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے۔ (مسلسل)

چند مہینے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے اپنی تحریک اور اپنے کام کا ایک خاکہ ترجمان القرآن میں شائع کیا اور اپنے ہم خیال دوستوں کو دعوت دی کہ "وہ فلاں تاریخ کو دارالاسلام میں جمع ہوں اور ایک جماعت یا ادارے کی باقاعدہ تشکیل ہو جائے ——

اس وقت اس عاجز کو مولانا کے بنائے ہوئے کام کے خاکہ سے اصولی درجہ میں پورا اتفاق تھا۔

تحریک دارالاسلام کے سلسلہ میں پہلا اجتماع اور میری مایوسی اور معذرت

بہرحال مقررہ تاریخ پر یہ عاجز بھی دارالاسلام پہنچا توقع یہ تھی کہ مولانا مودودی صاحب میں اصلاح و تبدیلی کا جو عمل شروع ہوا تھا، اب تک اس نے

(مسلسل) .... تخلیہ کا فیصلہ ہو گیا تو چودھری صاحب بھی پاکستان منتقل ہو گئے۔ وہاں بھی انھوں نے جوہر آباد میں دارالاسلام ہی کے طرز کی ایک بستی بنوائی —— راقم سطور محمد منظور نعمانی اور رفیق محترم مولانا علی میاں کو برابر خطوط لکھتے رہے کہ آپ دونوں کی یہاں ضرورت ہے اور یہاں کام کا میدان ہے۔ میں نے آپ لوگوں کے لئے یہاں پورے انتظامات کر لئے ہیں (یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان سے مسلمان برابر پاکستان منتقل ہو رہے تھے) آخر میں چودھری صاحب نے دستی خط دیکر ایک آدمی بھیجا اور تفصیل سے لکھا کہ آپ کے لئے یہ انتظامات کر لئے گئے ہیں "آپ دونوں مع اہل و عیال کے چلے آئیں"۔ اس آخری خط کے جواب میں اس عاجز نے چودھری صاحب کے اخلاص کا اعتراف اور حسن ظن اور عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ ہم نے متوکلاً علی اللہ طے کر لیا ہے کہ جب تک ہندوستان میں کچھ بھی مسلمان ہیں ہم ان کی خدمت کے لئے یہیں رہیں گے —— چودھری صاحب کی عمر تقسیم کے وقت میرا خیال ہے کہ ساٹھ سے اوپر ہی ہو گی لیکن ہمت کے جوان تھے، پاکستان پہنچنے کے بعد بھی مدت تک حیات رہے اور دین کی فکر اور خدمت کی دُھن ان کے ساتھ رہی۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص الخاص معاملہ فرمائے۔ نعمانی

کافی منزلیں طے کرلی ہوں گی، اور مولینا بہت بدل گئے ہوں گے لیکن وہاں پہنچ کر ایک دو دن مولانا کے ساتھ رہنا ہوا تو بڑے رنج کے ساتھ مایوسی ہوئی، اور اندازہ ہوا کہ ابھی انھوں نے اپنے کو بدلنے کا ارادہ ہی نہیں فرمایا ہے۔

دارالاسلام کے بانی چودھری نیاز علی خان صاحب اس عاجز کے بارہ میں کچھ غائبانہ واقفیت پہلے سے بھی رکھتے تھے، اس موقعہ پر ان سے پہلی ملاقات ہوئی انھوں نے بھی مولانا کے بارہ میں فکرمندی کے ساتھ اسی احساس و تاثر کا ذکر کیا جو میرا تھا (چودھری صاحب خود پورے متشرع اور خوش اوقات تھے)

مولانا مودودی کی دعوت پر اس اجتماع میں باہر سے آنے والوں میں میرے علاوہ چند حضرات اور بھی تھے، ان سب کی تعداد دس سے کم ہی رہی ہوگی۔[1]

اگلے دن جب وقت آیا کہ سب ایک جگہ بیٹھ کر جماعت یا ادارہ کی تشکیل کریں تو میں نے ذرا دیر پہلے تنہائی میں مولانا سے کہا کہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں آیا تو اسی ارادہ سے تھا کہ اس کام میں آپ کا رفیق بنوں گا لیکن یہاں آکر مجھ میں تذبذب پیدا ہوگیا ہے، اور میں نے مناسب سمجھا کہ میں پہلے ہی آپ کو بتلا دوں کہ اس وقت جو ادارہ یا جماعت بنے گی میں اس میں شرکت نہیں کرسکوں گا، لیکن آپ کے مقصد اور آپ کی دعوت سے مجھے اتفاق اور ہمدردی ہے۔

مودودی صاحب بڑے ذہین آدمی ہیں ــــ انھوں نے سمجھ لیا کہ کیا چیز میرے لئے رکاوٹ بنی ہے انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کے اس تذبذب اور تردد

---

[1] یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت ہندوستان یا پاکستان کی جماعت اسلامی میں جو حضرات جماعت کی قیادت کررہے ہیں، ان میں سے کوئی صاحب بھی مولانا مودودی صاحب کے دارالاسلام میں بلائے ہوئے اس پہلے اجتماع میں نہیں تھے، شاید وہ اس وقت مولانا سے واقف بھی نہیں ہوں

کی وجہ سمجھتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے کہ میں کس دنیا کا آدمی تھا اور کہاں سے چل کر آرہا ہوں آپ چاہتے ہیں کہ میں ایک دم بدل جاؤں، آپ جو کچھ چاہتے ہیں انشاء اللہ رفتہ رفتہ وہ ہو جائے گا اس لئے میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی رائے پر نظر ثانی کریں آپکے انکار کر دینے سے اور سبھوں پر بھی اثر پڑے گا۔ میں نے عرض کیا کہ شرکت کے فیصلہ کے لئے جس قلبی اطمینان کی ضرورت ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے اندر وہ اطمینان نہیں پا رہا ہوں اس لئے مجبور ہوں حالانکہ مجھے اپنے شریک نہ ہونے سے دکھ اور افسوس ہے، اگر آئندہ اللہ نے مجھے اطمینان نصیب فرما دیا تو میں انشاء اللہ آپ کے ساتھ باضابطہ بھی شریک ہو جاؤں گا، لیکن ضابطہ کی شرکت کے بغیر تعاون یوں بھی کروں گا اور دوسروں پر اثر پڑنے کی مشکل کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ میں مجلس میں اپنے اس تذبذب یا انکار کا پہلے اظہار نہ کروں بلکہ خاموش رہوں ـــــ چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا، دوسرے حضرات جب مجلس میں اپنی رائے ظاہر کر چکے ادارہ کی رکنیت قبول کرنے والے اپنی منظوری دے چکے اور معذرت کرنے والے معذرت کر چکے تو سب سے آخر میں میں نے اپنے متعلق بتایا کہ میں اس وقت رکنیت کا فیصلہ نہیں کر سکا ہوں ابھی مزید غور کروں گا

یہاں میں یہ واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میرے توقف یا انکار کی وجہ میرا یہ خیال تھا کہ اتنے اونچے دعووں کے ساتھ جو دینی جماعت یا ادارہ بنے اور اتنے اعلیٰ نصب العین کا دنیا کے سامنے اعلان کرے (جس کا تحریک کے خاکہ میں ذکر کیا گیا تھا) اگر اس کے قائد کی زندگی اس دعوت سے ضروری درجہ کی بھی مطابقت نہ رکھتی ہو تو اولاً تو وہ چلے گی نہیں اور قلم کی طاقت کے بل پر کچھ چلی بھی تو اس کے ذریعے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی، حالانکہ اس راہ کا بنیادی کام یہی ہے کہ مسلمانوں میں از سر نو ایمانی روح پھونکی جائے اور ان کی زندگی

میں دینی انقلاب برپا کیا جائے جیسا کہ حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے رفقائے کیا تھا۔

یہ ادارہ جو "دارالاسلام" کے احاطہ میں بیٹھ کر بنایا گیا تھا اس کا نام "ادارہ دارالاسلام" تھا، مولانا مودودی اس کے امیر تھے اور ان کے علاوہ غالباً صرف چار حضرات رکن بنے تھے۔[1]

مولانا مودودی کی دارالاسلام سے لاہور منتقلی اور اسلامیہ کالج لاہور سے وابستگی

چند ہی مہینوں کے بعد مولانا نے "دارالاسلام" سے لاہور منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اس فیصلہ کا سبب جیسا کہ اس وقت مجھے معلوم ہوا تھا مولانا کے بارہ میں بانیٔ دارالاسلام چودھری نیاز علی خان صاحب کے کچھ اسی قسم کے احساسات تھے جو میرے لئے ادارہ "دارالاسلام" کی شرکت کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔ واللہ اعلم

بہرحال مولانا لاہور منتقل ہو گئے۔ اور ترجمان القرآن وہیں سے نکلنے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد مولانا نے غالباً دینیات کے پروفیسر یا لیکچرر کی حیثیت سے لاہور کے اسلامیہ کالج سے بھی تعلق قائم کر لیا۔

اس تمام عرصہ میں مولانا سے میرا ذاتی تعلق علیٰ حالہ رہا۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا خط و کتابت بھی جاری رہی ـــ مجھے یاد ہے کہ ایک خط میں مولانا نے مجھے تفصیل سے لکھا تھا کہ کالج سے تعلق قائم کرنے کا فیصلہ ان کو کس وجہ سے کرنا پڑا ـــ جہاں تک اب یاد ہے کالج سے مولانا کا یہ تعلق تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ختم ہو گیا تھا جس کی

---

[1] ان چار میں ایک مولانا کے رسالہ ترجمان القرآن کے باتنخواہ منیجر صاحب بھی تھے جو سب سے زیادہ پُرجوش نظر آتے تھے، لیکن بعد میں انھوں نے مولانا کو بہت زیادہ مالی نقصان پہنچایا اور بہت غلط آدمی ثابت ہوئے۔

تفصیل میرے علم میں نہیں ہے۔

دارالاسلام کی تحریک ختم

کچھ عرصہ کے بعد ادارہ دارالاسلام کا ذکر "ترجمان القرآن" میں بھی آنا بند ہو گیا، پھر یا تو خود مولانا کے کسی خط سے یا کسی اور ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ مولانا اس کام کے آگے بڑھنے سے مایوس ہو گئے۔ اس لئے اب اس کی دعوت کا سلسلہ جاری نہیں ہے۔

ان دنوں میں میرا حال

خود میرا حال ان دنوں میں یہ رہا کہ دارالاسلام کی تشکیل کے وقت دو تین دن وہاں مولانا کے ساتھ رہ کر ان کے بارہ میں تو ذہن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت اچھا سوچنے اور بہترین لکھنے والا تو بنایا ہے لیکن دینی انقلاب کی مقدس مہم چلانے کے لئے جو صفات اور جو زندگی چاہیئے، اس سے مولانا بہت دور ہیں اور بظاہر ان صفات اور اس زندگی کے حاصل کرنے کا ان میں کوئی خاص داعیہ اور ارادہ بھی نہیں ہے۔ اس لئے مولانا کی طرف سے تو میں اس معاملہ میں بالکل مایوس ہو گیا لیکن ان کی تحریروں اور اپنے غور و فکر سے اس وقت جس قسم کی دینی جدوجہد کو میں نے ضروری سمجھ لیا تھا میں محسوس کرتا تھا کہ اس کا تقاضا روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے ـــــ لیکن خود اپنی صلاحیتوں اور کمزوریوں کا پورا دیانتدارانہ جائزہ لے کر میں اپنے بارہ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس قسم کے کسی کام کا میں خود قائد و علمبردار بننے کے لائق نہیں ہوں ہاں اگر کہیں ایسا کام شروع ہوا تو میں انشاءاللہ اس کا ساتھ دینے والا ایک سپاہی بن سکتا ہوں، اس لئے میں چاہتا تھا کہ اللہ کا کوئی بندہ یا کچھ بندے جو اہل ہوں وہ اس طرح کا کوئی کام کریں تو میں ان کے ساتھ لگ جاؤں

سیرت سید احمد شہید کی اشاعت، مولانا علی میاں سے ملاقات و مشورہ

یہی وہ زمانہ تھا کہ مولانا علی میاں کی "سیرت سید احمد شہید" پہلی دفعہ چھپی، انھوں نے از راہِ عنایت اس کا

ایک نسخہ مجھے بھی بھیجا۔ خوب یاد ہے کہ اسے پڑھ کر اندر ایک آگ سی بھڑک گئی۔
۔ میں نے اسی وقت مولانا علی میاں کو دار العلوم ندوہ لکھنؤ کے پتہ پر خط لکھا۔
۔ جہاں تک اب یاد ہے، اس میں کتاب سے متعلق اپنا تاثر ظاہر کیا تھا اور ساتھ ہی لکھا تھا کہ مجھے صفائی سے بتلائیے کہ آپ نے بس یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا جو لکھی گئی، یا وہ کام بھی کرنے کا ارادہ ہے جس کا یہ کتاب تقاضا کرتی ہے؟۔ اگر یہ دوسری بات ہے تو میں آپ سے جلد سے جلد ملنا چاہتا ہوں، اگر آپ کو کوئی مجبوری نہ ہو تو قریبی فرصت میں یہاں بریلی ایک دو دن کے لئے تشریف لے آئیں، اور اگر آپ کسی وجہ سے اس وقت نہ آسکتے ہوں تو مجھے بواپسی مطلع فرمادیں۔ میں انشاءاللہ خود آجاؤں گا

اس خط کا جواب مجھے مولانا نے اپنے وطن رائے بریلی سے دیا اور لکھا کہ میں اس وقت یہاں گھر پر مقیم ہوں اور فلاں وجہ سے اس وقت سفر سے معذور ہوں، آپ خود ہی یہاں آجائیں ۔۔ میں ممکنہ عجلت سے روانہ ہوگیا، اور رائے بریلی پہنچ گیا۔

یہاں اس کا ذکر کردینا بھی مناسب ہوگا کہ مولانا علی میاں بھی مولانا مودودی کے "ترجمان القرآن" کے مضامین سے میری طرح متاثر تھے اور اس لحاظ سے ہم دونوں کے خیالات اور جذبات میں پوری ہم آہنگی تھی ۔ رائے بریلی پہنچ کر تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ مولانا مودودی کا اور ان کے مضامین کا جو انھوں نے "آنے والے انقلاب" سے متعلق لکھے تھے اور جنھوں نے ہم دونوں کو بہت متاثر کیا تھا، خاص طور سے ذکر رہا۔ غالباً اس ملاقات اور صحبت میں میں نے "ادارۂ دارالاسلام" کی تاسیس کے سلسلہ میں اپنے پٹھان کوٹ کے سفر اور مولانا مودودی صاحب سے متعلق اپنے اندازہ اور احساسات کا بھی ذکر کیا ۔ بہرحال ہم دونوں اس پر متفق ہوگئے کہ اس وقت کے خاص حالات کے مطابق دین کی خدمت اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے جو کچھ ہوسکے وہ ہم کو کرنا چاہیئے اور بنام خدا اس کا آغاز کردینا چاہیئے ۔ ابتدائی کام اور

اس کے طریقۂ کار کے بارے میں بھی کچھ اصولی باتیں ہوئیں ـــ پہلا مرحلہ یہ تھا کہ ہم خیال مخلصین کی ایک جماعت بنے، میں نے علی میاں سے کہا کہ پہلے ہمیں ایک ایسی شخصیت تلاش کر لینا چاہیئے جو اپنے کو پوری طرح اس کام کے لئے وقف کر دے اس کی حیثیت امیر کی ہو اور اس میں وہ چیزیں کم از کم بقدر ضرورت موجود ہوں، جو ایسی جماعت کے امیر میں ہونی چاہیئں (مولانا علی میاں سے میں نے کہا کہ) اپنے متعلق میں پہلے ہی عرض کئے دیتا ہوں کہ اپنے کو جانچ تول کے میں اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں، کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں ـــ اب آپ اپنے بارہ میں صاف طور سے بتائیں کہ آپ یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں؟ ـــ مولانا نے بھی اس سے معذوری ظاہر کی اور اس کی وجوہات بتلائیں ـــ اسی گفتگو میں بعض اور ایسے حضرات کا بھی ذکر آیا، جن سے اس کی توقع کی جا سکتی تھی ـــ پھر ہم دونوں نے اس سلسلہ میں متعدد سفر بھی کئے۔ ان میں ایک سفر ایسے دور دراز مقام کا بھی تھا جہاں ہندوستان کی سرحد ختم ہو کر چند میل آگے کابل کی سرحد شروع ہو جاتی ہے لیکن ان سفروں اور ملاقاتوں کے نتیجے میں بھی اس وقت کے اپنے خیالات و جذبات کے مطابق کوئی اجتماعی کام شروع نہیں کیا جا سکا۔

یہ واقعات جن کا اوپر ذکر آیا غالباً ۳۸ء اور ۳۹ء کے ہیں۔ اس زمانہ میں باشعور مسلمانوں کے جذبات میں عام طور سے ایک تلاطم برپا تھا اور ایسے کسی کام کے لئے زمین خاصی تیار تھی، اس لئے اس وقت طبیعت اس کے لئے سخت بے چین تھی، کہ ایسا کوئی کام شروع ہو، اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے دل کی زمین میں اس کا تخم خلافت کی تحریک کے زمانہ میں ہی پڑ چکا تھا۔

دوسری جنگ عظیم

پھر ۳۹ء میں جب دوسری جنگ شروع ہو گئی تو اس وقت یہ بے چینی اور بھی زیادہ بڑھ گئی، کیونکہ

محسوس ہوتا تھا کہ یہ جنگ دنیا کے اور قوموں کے نقشوں میں غالباً بڑی بڑی تبدیلیوں کا ذریعہ بنے گی۔

جنگ شروع ہو جانے کے بعد سے مولانا مودودی صاحب نے "ترجمان القرآن" میں جو مضامین مسلسل ہندوستانی تحریکات اور مسلمانوں کے نصب العین کے متعلق لکھے انھوں نے اس داعیہ کو اور بھی تیز کیا اور اس بے چینی کو اور آگے بڑھایا پھر ان مضامین کی آخری قسطوں سے معلوم ہوا کہ مولانا اب پھر کوئی جماعت اس کام کے لئے بنانا چاہتے ہیں جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں[1]

---

[1] اس سلسلہ کا ان کا ایک اہم مضمون جماعت کی تاسیس سے کچھ ہی پہلے ترجمان القرآن سے نقل ہو کر رجب ۶۰ھ کے الفرقان میں بھی شائع کیا گیا تھا اس کا عنوان تھا "دنیا میں کیا ہو رہا ہے — اور ہمارا فرض کیا ہے؟" — یہ مضمون گویا جماعت اسلامی کی تاسیس کی تمہید تھا — قریباً اسی زمانہ میں اس عاجز نے بمبئی کے دوستوں کی دعوت پر وہاں کا سفر کیا تھا اور وہاں مسلسل ۸ — ۱۰ تقریریں کی تھیں۔ ان تقریروں کا موضوع اور مرکزی نقطہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور اسلامی انقلاب کے لئے ایک منظم تحریک کی دعوت تھی — مجھے اعتراف ہے کہ اس زمانہ میں مولانا مودودی سے میں اتنا متاثر تھا کہ ان کی اصطلاحوں اور انھیں کی زبان میں بولتا تھا مثلاً اسلام کو "ایک انقلابی تحریک" کہتا تھا، بمبئی کی میری یہ تقریریں مرتب ہو کر پہلے الفرقان میں اور پھر "خطبات بمبئی" کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہو گئی تھیں۔ ان تقریروں کو بھی میری طرف سے "جماعت اسلامی" کی تمہید کہا جا سکتا ہے — میرا حال اس زمانہ میں یہ تھا کہ مودودی صاحب کی صرف تعبیرات ہی کو نہیں بلکہ ان کے خاص افکار و نظریات کو بھی میرا ذہن اکثر بغیر کسی تنقید کے اپنا لیتا تھا۔ اسی دور میں "الفرقان" کا "شاہ ولی اللہ نمبر" شائع ہوا تھا۔ مولانا مودودی نے میری فرمائش پر اسی کے لئے وہ مضمون یا مقالہ لکھا تھا جو بعد میں رسالہ "تجدید و احیائے دین" کے نام سے الگ بھی شائع ہوا۔ اور جماعت اسلامی کے بنیادی لٹریچر میں شامل ہے۔ اگرچہ اس وقت بھی میرے ذہن نے اس کی بعض باتوں کو قبول نہیں کیا تھا لیکن جہاں تک اب یاد ہے میں اس کو اس وقت مجموعی حیثیت سے ایک بصیرت افروز... (مسلسل)

میرا لاہور کا سفر اور جماعت کے قیام کے بارہ میں مودودی صاحب سے گفتگو

انہی دنوں میرا لاہور کا ایک سفر ہوا، بعض دوست جو میری ہی طرح مولانا مودودی سے خاص تعلق رکھتے تھے اور ان کے مضامین اور ان کی دعوت سے کافی متاثر، اور دینی دعوت کا کام شروع ہونے کے لئے بے چین تھے، مولانا کے قریب لاہور ہی میں انھوں نے قیام اختیار کر لیا تھا انہیں یہ بات کسی درجہ میں معلوم تھی کہ میں مولانا مودودی سے ذاتی دوستانہ تعلق رکھنے اور ان کی دعوت اور ان کے اس وقت کے موقف سے اصولی طور پر متفق ہونے کے باوجود موصوف میں کوئی کمی محسوس کرنے کی وجہ سے "ادارہ دارالاسلام" کی تشکیل کے وقت اس کی رکنیت قبول نہیں کر سکا تھا۔ بہر حال جب میں لاہور پہنچا تو ان دوستوں نے مجھ سے باتیں کیں اور اس سلسلۂ گفتگو میں مجھے یہ بھی بتایا کہ مولانا کی زندگی میں اب کافی تبدیلی آ گئی ہے اور ہمارے نزدیک اب جماعت بنا کر کام شروع کر دینے کا وقت آ گیا ہے

میں جیسا کہ اوپر تفصیل سے لکھ چکا ہوں، قریباً دو سال سے اس بے چینی میں مبتلا تھا اور مختلف کوششوں کے باوجود ایسا دینی کام جیسا کہ میں اس وقت چاہتا تھا کہیں شروع نہیں ہو سکا تھا اس لئے میں پھر کچھ آمادہ ہو گیا، پھر بھی میں نے مزید اطمینان کے لئے مولانا مودودی سے کچھ صاف صاف باتیں کرنا ضروری سمجھا چنانچہ جب اُن سے ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے آپ ہی کے متعلق تنہائی میں کچھ باتیں کروں گا۔ وہ بخوشی اس کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا، آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی رائے سے بہت بڑی حد تک اتفاق اور آپ کے ساتھ گہری ذاتی محبت اور تعلق کے باوجود میں ادارہ

(مسلسل)...... تحقیقی مقالہ سمجھنا تھا اور عام اشاعت کی نیت سے اس کو شاہ ولی اللہ نمبر سے الگ مستقل رسالہ کی شکل میں بھی چھپوایا تھا۔

دار الاسلام" کی تشکیل کے وقت رکن بننے سے کیوں رک گیا تھا میرے نزدیک یہ تو صحیح ہے کہ ہم میں سے معصوم کوئی بھی نہیں ہے اور کسی دینی کام کے لئے کسی معصوم یا کامل ترین شخصیت کا انتظار کرنا غلط ہے' لیکن مجھے اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ جس قسم کا کام ہم آپ شروع کرنا چاہتے ہیں اس کے قائد کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی زندگی اس کی دعوت سے مطابقت رکھتی ہو، اگر ایسا نہیں ہوگا تو دعوت کے ساتھ نہ تو اللہ کی نصرت ہوگی اور نہ لوگ اس سے متاثر ہوں گے. میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اس پورے عرصہ میں اس قسم کے کام کے لئے میں بے چین رہا ہوں اور آپ سے مایوس ہونے کے بعد میں نے اس کے لئے مختلف کوششیں کیں، لیکن کوئی کام شروع نہیں ہو سکا. اب مجھے ترجمان القرآن سے بھی معلوم ہوا تھا اور یہاں رہنے والے میرے آپ کے دوستوں نے بھی بتایا ہے کہ اب پھر اس مقصد اور اس دعوت کیلئے جماعت بنانے کا ارادہ کیا جا رہا ہے، میں اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے آپ کے متعلق کچھ معلومات خود آپ سے ہی حاصل کرنا چاہتا ہوں ـــ مولانا نے فرمایا آپ یہ کیوں فرض کرتے ہیں کہ جماعت کا قائد میں ہی بنوں گا، آپ کسی ایسے کو سوچئے جو آپ کے نزدیک اہل ہو، میں کہتا ہوں کہ آپ ہی اس ذمہ داری کو کیوں نہ قبول کریں! میں نے کہا، جہاں تک میری ذات کا سوال ہے' میں اپنے کو خوب تول کر یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں ایسی کسی جماعت کی قیادت کا ذمہ دار بننے کے لائق نہیں ہوں اگر یہ بات نہ ہوتی تو اب تک میں میدان میں خود کود چکا ہوتا، اس لئے اس امکان پر بحث نہ کیجئے' کوئی اور آدمی بھی میری نظر میں نہیں ہے بلکہ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ گزشتہ دس برسوں میں میں نے اس کی کوشش کی کہ کوئی اللہ کا بندہ جو اس کا اہل ہو وہ کھڑا ہو جائے لیکن میں ناکامیاب رہا. اس لئے ہوگا یہی کہ اگر آپ کوئی جماعت بنائیں گے تو اس کے قائد یا امیر آپ ہی ہوں گے' اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں

کہ اپنے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کے بارے میں خود آپ سے صاف صاف باتیں کر لوں۔

اس کے بعد میں نے مولانا سے چند سوالات کئے ان میں کے جو یاد ہیں وہ یہ ہیں:
میں نے پوچھا، صفائی سے بتائیے کہ احکام شریعت کے بارے میں اس وقت آپ کا طرز عمل کیا ہے؟

انھوں نے بتایا، میں اپنے امکان کی حد تک احکام شریعت کی پابندی کرتا ہوں اور کرنا چاہتا ہوں۔

پھر میں نے ان سے کہا، یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ تقلید شخصی کو ضروری نہیں سمجھتے لیکن میرا خیال ہے کہ فتنوں کے اس زمانہ میں یہ آپ بھی ضروری سمجھتے ہونگے کہ جس مسئلہ پر ائمہ اربعہ متفق ہوں اس کے خلاف نہ کیا جائے؟

انھوں نے کہا کہ ہاں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں اور اس سے خروج کو جائز نہیں سمجھتا۔

(اس زمانہ تک بھی مولانا کی داڑھی بہت مختصر سی تھی۔ اور سر پر انگریزی بال بھی رہتے تھے) میں نے دوستانہ بے تکلفی کے ساتھ ان کی داڑھی کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا ایسی داڑھی رکھنا آپ کے نزدیک جائز ہے؟

مولانا نے فرمایا، ہاں میں حرام یا ناجائز نہیں سمجھتا، البتہ خلاف اولیٰ سمجھتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ داڑھی اتنی ہونی ضروری ہے کہ دور سے نظر آئے اور بقدر یکمشت سنت ہے ــــ میں نے عرض کیا کہ کتب فقہ میں تو بقدر یکمشت کو واجب لکھا ہے اور جو لوگ اس سے چھوٹی رکھتے اور کترواتے ہیں انکے اس طرز عمل کو ناجائز کہا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے۔ میں نے اس وقت فتح القدیر اور در مختار وغیرہ کی یہ عبارت جو اس وقت بھی زبانی یاد تھی پڑھ کر سنائی:

واما ما یفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال من قصها

وهی دون القبضۃ فلم یبحہ احدٌ؎

مولانا نے فرمایا لیکن فقہ حنبلی کی کتاب "مُغنی" میں تصریح ہے کہ اس سے کم رکھنا بھی جائز ہے، میں نے عرض کیا، میں نے مُغنی نہیں دیکھی اس لئے اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن ایک اصولی بات یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر عام فقہائے مجتہدین ایک فعل کو ناجائز کہتے ہیں اور کسی کتاب میں کوئی قول اس کے جواز کا بھی ہو اور اس کے کرنے میں کوئی شرعی مصلحت بھی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ تقوٰی اور احتیاط کا تقاضا یہی ہوگا کہ اس سے بچا جائے۔ علاوہ ازیں صحاح کی جن حدیثوں میں داڑھی رکھنے کا حکم بصیغۂ امر دیا گیا ہے، ان میں دو لفظ آتے ہیں ایک "اَعفُوا اللِّحیٰ" اور دوسرا "اَرخُوا اللِّحیٰ"۔ "اَعفُوا" اور "اَرخُوا" کے جو مصدر ہیں یعنی "اعفا" اور "ارجاء" عربی لغت کی رُو سے یہ فی الجملہ درازی اور بڑھوتری کو چاہتے ہیں۔ فقہائے نے غالباً صحابہ کے طرزِ عمل سے یہ سمجھا ہے کہ اگر قریباً ایک مشت داڑھی رکھی جائے تو ان لفظوں کا مطالبہ پورا ہو جائے گا، پس فقہ کی تصریحات سے تھوڑی دیر کے لئے صرفِ نظر کر کے بھی اگر آپ غور فرمائیں تو تنا آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ صرف اتنی داڑھی رکھنے سے جو بقول آپ کے بس دور سے نظر آئے ان لفظوں کا مطالبہ پورا نہیں ہوتا، بلکہ ان الفاظ کا صاف تقاضا یہ ہے کہ داڑھی کو کچھ لمبا، بڑھا ہوا اور لٹکا ہوا ہونا چاہیئے اور آپ کی موجودہ داڑھی بہت چھوٹی ہے۔ اس لئے میرے نزدیک حدیث کی رُو سے بھی اس کے جواز کی گنجائش نہیں ہے۔

مجھے یاد ہے، مولانا نے میری یہ بات سُن کر کچھ دیر خاموشی سے غور کرنے کے بعد فرمایا میں نے اس طرح اور اس پہلو سے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ آپ کی

؎ مطلب یہ ہے کہ بعض اہلِ مغرب اور مخنّث لوگوں کا یہ طرزِ عمل کہ وہ داڑھی ایک مشت سے کم رکھتے اور کترواتے ہیں یہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں (یہاں اہلِ مغرب سے مراکش اور ٹیونس وغیرہ ممالک کے لوگ مراد ہیں)۔

بات صحیح ہے اور مجھے اس کی اصلاح کر لینی چاہیئے۔

اس کے بعد میں نے مولانا کے بالوں کی طرف اشارہ کر کے اسی دوستانہ انداز میں کہا کہ کیا اس طرح کے بال رکھنے میں آپ کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے؟ — مولانا نے فرمایا کیا یہ آپ کے نزدیک "قزع" ہے، جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے؟ میں نے کہا میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ "قزع" ہے لیکن یہ کہتا ہوں کہ اس طرح کے بال رکھنا صالحین کے طریقے کے خلاف اور غیر صالحین کا طریقہ ہے، اور خاص کر جو لوگ دین اور شریعت کی پابندی کے داعی ہوں ان کے لئے ایسی چیزوں کی بالکل گنجائش نہیں ہے — اس پر بھی مولانا نے فرمایا کہ یہ بات بھی آپ کی ٹھیک ہے، میں اس کی بھی اصلاح کر لوں گا[1] اس صحبت میں

---

[1] یہاں افسوس کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار بھی ضروری ہو گیا ہے کہ اس گفتگو کے تقریباً ۸ مہینے کے بعد جب جماعت اسلامی کا ایک مشاورتی اجتماع فروری ۱۹۴۲ء میں ہوا اس وقت تک بھی مولانا اسی حال میں تھے جس حال میں اس گفتگو کے وقت تھے اور اس وجہ سے ان سے اس موضوع پر پھر کچھ عرض کرنا پڑا تھا جس کا ذکر آگے آجائے گا، اس کے بعد الحمدللہ مولانا نے دونوں چیزوں کی اصلاح فرمالی —

اس سلسلہ میں یہ بات بھی دکھ اور رنج کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ اب سے ۲۲ سال پہلے جب "الفرقان" میں اپنی سرگزشت کے ضمن میں راقم سطور نے مولانا مودودی صاحب کے ساتھ اپنی اس گفتگو کا ذکر کیا تھا تو "جماعت اسلامی" کے مجاہدین قلم نے اس "گستاخی" اور "جہالت" پر میری خوب خبر لی تھی کہ اقامت دین کی مقدس تحریک کے سلسلہ میں میں نے داڑھی کی مقدار اور انگریزی فیشن کے بالوں جیسے مسائل اٹھائے تھے (جو ان کے نزدیک غالباً ناقابل توجہ تھے) اس کے بارے میں جو کچھ ان حضرات سے اور جماعت کے ذمہ داروں سے عرض کرنا مناسب سمجھا گیا اسی زمانہ میں عرض کر دیا گیا تھا لیکن اس وقت اس سلسلہ میں مزید یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ ظلوم و جہول اپنے ربّ کریم

(مسلسل)

مولانا سے میں نے ان کے ذاتی حالات سے متعلق بعض اور باتیں بھی دریافت کیں، اور انھوں نے بے تکلف مجھے جواب دیا۔

یہ ساری گفتگو نہایت دوستانہ اور مخلصانہ فضا میں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اپنا اطمینان ظاہر کرکے مولانا سے کہا کہ اب آپ کوئی تاریخ مقرر کرکے جماعت کی تشکیل کے لئے ہم خیالوں کو دعوت دیجئے۔ یاد آتا ہے کہ غالباً اس وقت میرے مشورہ ہی سے تاریخ مقرر ہوئی اور دعوت دی گئی۔

جماعت اسلامی کی تاسیس میں میری شرکت اور میرا حصہ

مقررہ تاریخ پر ہم خیال حضرات اچھی خاصی تعداد میں جمع ہوگئے، اور جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی (یہ شعبان ۶۰ھ اگست ۴۱ء کا مہینہ تھا)۔ یہ ناچیز اس وقت پورے اطمینان کے ساتھ اس میں شریک ہوا تھا۔ اور جماعت کی امارت کے لئے مولانا مودودی صاحب کا نام میں نے ہی پیش کیا تھا اور اس موقعہ پر یہ وضاحت کی تھی کہ "دستور" کے لحاظ سے "امیر" میں جو صفات ہونی چاہیئں (تقوی، علم دین میں بصیرت، اصابت رائے اور حزم وعزم) خدا کے فضل سے وہ سب ان میں موجود ہیں، اور اس حیثیت سے جماعت کے موجودہ ارکان میں وہ فائق و ممتاز ہیں، ان کی علمی بصیرت اور فکری امتیاز کا تو میں پہلے سے قائل تھا اور تقوی کہیئے یا اتباع شریعت، اس بارہ میں ان کی اس گفتگو سے میں نے اپنے دل کو مطمئن کر لیا تھا جو چند روز پہلے ہوئی تھی

(مسلسل)..... کے اس کرم و احسان کا دل و زبان اور قلم سے شکر گزار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کے اس رویہ ہی کو مولانا کی داڑھی اور بالوں کی اصلاح کا ذریعہ بنا دیا اور الحمد للہ بالآخر مولانا کی داڑھی ہندوستان و پاکستان کے علماء کی سی خوب صورت مولویانہ داڑھی ہوگئی۔ اور بالوں کی بھی اصلاح ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے تمام محبین و متبعین کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔

(جس کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے) اس تاسیسی اجتماع میں میرا جو خاص حصّہ رہا اس کا ذکر غالباً اجتماع کی روداد میں بھی کیا گیا تھا۔ یاد آتا ہے کہ اجتماع میری دُعا ہی پر ختم ہوا تھا۔ میں صرف جماعت کا رکن ہی نہیں تھا بلکہ مجھے "نائب امیر" بھی بنایا گیا تھا اور مختلف علاقوں کے لئے تین حضرات اور بھی نائب امیر بنائے گئے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی۔ مولانا سیّد صبغۃ اللہ مدراسی، مولانا سیّد جعفر ندوی پھلواروی۔ لیکن بعد میں غالباً یہ "نائب امیر" کا منصب جماعت اسلامی کے نظام میں ختم کر دیا گیا

جماعت اسلامی کی تاسیس و تشکیل کے بعد
جماعت کے سلسلہ میں میرا کام

اجتماع سے واپس آکر الفرقان کے شوال کے شمارہ میں میں نے — "ایک دینی تحریک کا تعارف" کے زیرِ عنوان ایک مضمون لکھا جس میں پوری تفصیل سے اس اجتماع اور جماعت اسلامی کی تاسیس و تشکیل کا تذکرہ کیا تھا اور اس کے مقصد و نصب العین اور دعوت و طریق کار کی وضاحت کی۔ اس مضمون میں میں نے جماعت کا دستور بھی بلفظہٖ شامل کیا تھا۔ بعض خاص نکات اور خاص کر امیر کی حیثیت سے متعلق مولانا مودودی صاحب کی تقریروں کے طویل طویل اقتباسات بھی نقل کئے تھے۔ آخر میں "بعض شکوک و شبہات اور ان کے جوابات" کے عنوان سے راقم سطور نے ایک مستقل مضمون لکھا تھا جس میں جماعت اور مولانا مودودی صاحب کی ذات سے متعلق ان تمام اعتراضات اور شکوک و شبہات کا جواب دیا گیا تھا جو اُس وقت تک سامنے آئے تھے یا جن کا اندیشہ تھا — اپنے نزدیک اس عاجز نے اس مضمون میں انتہائی دلسوزی و دردمندی اور پوری قوت و اعتماد کے ساتھ عام مسلمانوں بالخصوص خواص امت کو جماعت میں شرکت یا کم از کم تعاون کی دعوت دی تھی۔ یہ مضمون (ایک دینی تحریک کا تعارف) "الفرقان" کے ۳۵ صفحات

پر آیا تھا۔ اور الفرقان کے حوالہ سے اس کو مولانا مودودی صاحب نے "ترجمان القرآن" میں بھی شائع کیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ "جماعت اسلامی" کی ایسی مکمل، اتنی مدلل دعوت کی وضاحت اس وقت تک خود مولانا مودودی صاحب کے قلم سے "ترجمان القرآن" میں بھی نہیں آئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس زمانہ میں جماعت کی دعوت و وکالت کے جذبہ سے سرشار تھا، جہاں جانا ہوتا اور جس مجلس میں بات کرنے کا اتفاق ہوتا، اکثر یہی میری گفتگو کا موضوع ہوتا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ میرے بعض دینی اکابر کو میرا یہ اقدام ناپسند ہے لیکن میں اپنے اقدام کو بالکل صحیح اور اپنے ان اکابر کو یہ خیال کر کے معذور سمجھتا تھا کہ ان کے سامنے وہ صورت حال اور وہ پوری بات نہیں ہے جو میرے سامنے آگئی ہے (اس وقت تک ہماری جماعت دیوبند کے اکابر کی طرف سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی اس طرح کی مخالفت اور سخت تنقید شروع نہیں ہوئی تھی جو بعد میں سامنے آئی، البتہ جماعت کے اکثر اکابر مولانا مودودی صاحب اور جماعت کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے)

پھر شوال کے اس شمارہ کے بعد ذیقعدہ و ذی الحجہ کے مشترک شمارہ میں جماعت سے متعلق کئے جانے والے سوالات اور شکوک و شبہات کے جواب ہی میں ایک اور مستقل مضمون لکھا، اس کا عنوان تھا "کچھ جماعت اسلامی سے متعلق" یہ گیارہ صفحے کا مضمون تھا۔ بہر حال جماعت کی تاسیس کے بعد سے "الفرقان" مولانا مودودی صاحب کے "ترجمان القرآن" ہی کی طرح "جماعت اسلامی" کا آرگن ہو گیا تھا، اس وقت اس کی یہی دعوت تھی اور یہی اس عاجز کی زندگی کا موضوع ــــ

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جماعت کی تاسیس کے کئی مہینے بعد مولانا مودودی نے مجھے ایک خط کے ذریعے یہ خوشخبری سنائی کہ ــــــ

مولانا محمد علی کاندھلوی صاحب[1] نے بھی جماعت کی رکنیت قبول کرلی ہے اور بڑے جذبہ سے آئے ہیں، راقم سطور کو اس اطلاع سے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ مولانا موصوف ہمارے حلقہ (جماعت دیوبند) کے ایک صاحب علم تھے اور اس دور میں اس عاجز کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ہماری جماعت جماعت اسلامی کی دعوت کو اپنالے — لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد مولانا مودودی صاحب کی تحریریں پڑھ کر ان کے ذہن میں کچھ اعتراضات اور خدشات پیدا ہونے لگے، اس سلسلہ میں انھوں نے مولانا مودودی صاحب سے خط وکتابت کی، جس کی مجھے مولانا نے خط سے اطلاع دی۔ پھر مجھے بھی کئی صفحے کا ایک طویل خط مولانا محمد علی صاحب نے لکھا۔ میں نے پوری تفصیل سے اس کا جواب دیا اور ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی میرا یہ جوابی خط بھی "جماعت اسلامی" کی وکالت و مدافعت کے سلسلہ کی اہم تحریریں میں سے ہے۔ یہ جمادی الاخریٰ سنہ ۶۱ھ کے الفرقان میں شائع ہوا تھا، ۱۵ صفحات پر تھا۔ پھر اس کو مولانا مودودی صاحب نے "الفرقان" کے حوالہ سے "ترجمان القرآن" میں بھی شائع کیا تھا، اس کا عنوان تھا — "جماعت اسلامی کی حقیقت اور ہمارے کام کی نوعیت — بعض شبہات کا جواب" — اس وقت میرا خیال تھا کہ یہ مضمون لکھ کر میں نے جماعت اسلامی" کے معترضین پر حجت تمام کردی ہے۔

جماعت کے اس ابتدائی دور میں جماعت کی دعوت سے متعلق مولانا مودودی صاحب کی ہر اہم تحریر بالالتزام "الفرقان" میں شائع کی جاتی تھی، ان کا مشہور مقالہ "اسلامی حکومت کیونکر قائم ہوتی ہے" اور اس سے پہلے ایک دوسرا مقالہ

---

[1] یہ مولانا کاندھلوی ایک صاحب مطالعہ اور صاحب نظر عالم دین تھے، سیالکوٹ میں قیام تھا، ملک کی تقسیم کے بعد بھی وہیں رہے۔ غالباً ابھی اسی دنیا میں ہوں گے کیونکہ کوئی دوسری خبر نہیں ملی ہے۔

"اسلام کا نظریۂ سیاسی"۔ یہ دونوں بھی "الفرقان" میں شائع کئے گئے، اور ان کو میں نے الگ مقالہ کی شکل میں بھی چھپوایا تھا، تاکہ حسب موقع لوگوں کو مفت بھی دیا جا سکے جیسا کہ عرض کیا گیا، اس دور میں "الفرقان" جماعت اسلامی کا آرگن تھا اور اس کی دعوت و وکالت ہی اس عاجز کی زندگی کا موضوع تھا۔ اور ارشاد نبویؐ ؛
"لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ" کے مطابق جی چاہتا تھا کہ اللہ اور رسول پر ایمان رکھنے والے سارے ہی بندوں کا یہی حال ہو جائے اس واقعہ کے اظہار میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ اس وقت یہ اظہار غالباً مناسب ہی ہوگا کہ اس وقت جماعت میں مولانا مودودی کے بعد اس ناچیز ہی کو سمجھا جاتا تھا، خود مولانا بھی میرے ساتھ خصوصی اکرام کا معاملہ فرماتے تھے جس کا مجھے ممنون ہونا چاہیئے۔

جماعت کی تاسیس کے بعد میرا، لکھنؤ، اعظم گڑھ وغیرہ کا سفر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ میرا جو رابطہ اور تعلق تھا اور خیالات و جذبات میں جو ہم آہنگی تھی اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ وہ لاہور کے اس اجتماع میں شریک نہیں ہوئے تھے جس میں جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی، لیکن اس اجتماع کی اور جماعت کی تشکیل کے سلسلہ کی ساری تفصیلات مولانا موصوف کو بعض ان رفقائے جماعت سے معلوم ہو چکی تھیں جو لکھنؤ سے لاہور پہنچ کر اس تاسیسی اجتماع میں شریک ہوئے تھے، نیز اس سلسلہ میں میری ان کی خط و کتابت برابر ہوتی رہی تھی ۔۔۔ بہرحال انھوں نے جماعت میں شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا اور مجھے اس کی اطلاع دیدی تھی میں نے ایک سفر لکھنؤ کا کیا۔ جن حضرات کے ذہن "ترجمان" کے مطالعہ سے "جماعت اسلامی" کی دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے، ان کا ایک مختصر سا اجتماع ایک رفیق کے مکان پر ہوا۔ میں نے

تفصیل سے دعوت کا تذکرہ کیا اور لاہور کے تاسیسی اجتماع کی کارروائی اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات ذکر کئے اور پھر جماعت میں شرکت کے شرائط وغیرہ بیان کئے مولانا علی میاں اور چند اور دوستوں نے اسی اجتماع میں کلمۂ شہادت کے اعادہ کے ساتھ باقاعدہ جماعت کی رکنیت قبول کی ۔[1]

اسی زمانہ میں میں نے ایک سفر اعظم گڑھ کا بھی کیا ۔ اب یاد نہیں رہا شاہ گنج اور اعظم گڑھ کے درمیان کس اسٹیشن پر ادھر سے جانے والی اور اُدھر سے آنے والی ٹرینیں کسی سبب سے کچھ دیر کے لئے کھڑی ہوگئیں ۔ میں نے دیکھا کہ اعظم گڑھ سے آنے والی ٹرین کے (اُس وقت کے) سکنڈ کلاس میں مولانا سید سلیمان ندوی تشریف فرما ہیں میں جلدی سے اپنی ٹرین سے اتر کر ملاقات کے لئے ان کے پاس پہنچا ، سلام اور مزاج پرسی کے بعد سید صاحب نے پہلی بات یہ فرمائی کہ ــــ جماعت اسلامی میں مودودی صاحب کے ساتھ آپ بھی شریک ہیں ، کیا آپ اُن کے بارے میں بالکل مطمئن ہیں ؟ ــ میں نے عرض کیا کہ میں تو اطمینان کر کے ہی شریک ہوا ہوں ۔ فرمایا ، خدا کرے آپ کا اطمینان درست ہو ۔ مجھے تو ان کی تحریروں میں تجدد کی بو آتی ہے ، ایسے لوگ دین کے معاملہ میں بھروسہ کے قابل نہیں ہوتے ــــ اس کے بعد سید صاحب کی ٹرین روانہ ہونے لگی اور میں آکر اپنی ٹرین میں بیٹھ گیا ۔

مولانا امین احسن صاحب سے ملاقات

اسی سفر میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر پہنچ کر مولانا امین احسن صاحب اصلاحی سے ملا ۔ مولانا سے میرا کوئی خاص تعلق یا تعارف اس وقت تک غالباً نہیں تھا شاید ایک دو دفعہ ملاقات کی نوبت آئی ہو ، اور کبھی کبھار انھوں نے ' پایا

[1] جماعت کی رکنیت قبول کرتے وقت کلمۂ شہادت کے اعادہ کا معمول اسی طرح تھا جس طرح مشائخ سلوک کے ہاں بیعت کے وقت کلمۂ شہادت کے اعادہ کا معمول ہے ۔

میں نے کسی ضرورت سے خط لکھا ہو لیکن معلوم نہیں کیوں وہ میرے ساتھ خاص محبت اور اعتماد کا اظہار فرماتے تھے۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی مناسب ہو گا کہ جس زمانہ میں مولانا مودودی کا قلم بڑی تیزی اور بڑی طاقت کے ساتھ جنگ آزادی میں کانگریس کا ساتھ دینے والے مسلمان حلقوں کے خلاف چل رہا تھا تو مولانا امین احسن، مولانا مودودی کی تحریروں کا جواب لکھنے والوں میں تھے، بلکہ جہاں تک مجھے یاد ہے سچی بات یہ ہے کہ ان دنوں میں صرف انہی کی تحریریں ایسی ہوتی تھیں جن کو کسی درجہ میں مولانا مودودی کی تحریروں کا جواب کہا جا سکتا تھا لیکن ۳۹ء میں جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد مولانا مودودی نے جب مسلمانوں کے دوسرے گروہ (مسلم لیگ وغیرہ) کے رویہ پر اسی قسم کی سخت تنقید شروع کی اور یہ ظاہر کر دیا کہ ان کی اصل دعوت "لتکون کلمة الله هی العلیا" کی ہے اور ان کا موقف مسلم قومیت کے پرستاروں سے بھی اتنا ہی الگ ہے جتنا کہ نظریہ وطنیت کے پرستاروں سے، تو مولانا امین احسن کی رائے مولانا مودودی کے ساتھ ہو گئی اور جب جماعت اسلامی کی تاسیس عمل میں آئی تو چند روز کے بعد انھوں نے بھی اس کی رکنیت قبول کر لی۔ میں جب سرائے میر پہنچا ہوں تو مولانا امین احسن جماعت کے رکن بن چکے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے مجھ سے کہا کہ بھئی! صاف بات یہ ہے کہ میں مودودی صاحب کو نہیں جانتا، تمہیں جانتا ہوں، اگر مودودی صاحب کل کو کسی غلط راستہ پر چل پڑے تو میں تو خدا کے سامنے تمہیں پکڑ کے پیش کروں گا کہ ان سے پوچھئے، میرے ذمہ دار بھی یہی ہیں ـــ لیکن یہ گفتگو کچھ اس طرح کی تھی کہ میں نے اس کو ایک طرح کا مزاح ہی سمجھا۔ البتہ میں نے اس موقعہ پر انہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھا کہ مودودی صاحب کے بارے میں میرا خیال اور اندازہ کیا ہے؟ مجھے یاد آتا ہے کہ اس وقت میں نے ان سے کہا تھا کہ اصل بات یہ ہے کہ اس دعوت اور اس کام کے لئے جیسا قائد چاہیئے مودودی صاحب ویسے

تو نہیں ہیں، لیکن اگر ان کے ساتھ دو چار آدمی اور ایسے مل جائیں جو ان کسروں کو کچھ پورا کریں جو اُن میں ہیں تو انشاء اللہ کام کچھ چل جائے گا

تاسیسی اجتماع کے ۶ ماہ بعد
دوسرا اجتماع

پھر تاسیسی اجتماع کے تقریباً چھ مہینے کے بعد جماعت اسلامی کے اہل حل و عقد کی مجلس شوریٰ کا لاہور میں اجتماع ہوا میں اس وقت آنکھوں کی سخت تکلیف میں مبتلا تھا، آنکھوں میں زخم ہو گئے تھے اور پٹی بندھی رہتی تھی، گھر والے کسی طرح اس کے روادار نہیں تھے کہ میں اس حالت میں سفر کروں، لیکن میں نے اسی حال میں بریلی سے لاہور تک کا سفر کیا اور اجتماع میں شرکت کی۔ مولانا امین احسن اور مولانا علی میاں بھی اس میں شریک ہوئے اور جماعت کے کسی اجتماع میں ان دونوں حضرات کی یہ پہلی شرکت تھی۔ مودودی صاحب کی ظاہری ہیئت کے اُن پہلوؤں میں جن کی اصلاح کا انھوں نے وعدہ کیا تھا خاطر خواہ تبدیلی نہ دیکھ کر مجھے سخت افسوس اور دکھ ہوا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس سلسلہ میں اب میں خود ان سے کچھ نہ کہوں، اس لئے میں نے تنہائی میں مولانا امین احسن صاحب سے کہا کہ آپ ان چیزوں کی طرف اپنی طرف سے مولانا کو توجہ دلائیں تاکہ مولانا کو یہ محسوس ہو کہ صرف میں ہی ان اصلاحات کو ضروری نہیں سمجھتا ہوں بلکہ مولانا امین احسن اصلاحی جیسے قریب قریب انہیں کے طرز کے روشن خیال عالم بھی اسکو ضروری سمجھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ لاہور سے رخصت ہوتے وقت مولانا امین احسن صاحب نے میری موجودگی ہی میں مولانا مودودی اور اُن رفیقوں سے جو وہاں مستقل ان کے ساتھ رہتے تھے بات کی اور کہا کہ میں بہت صفائی کے ساتھ یہ بات ظاہر کر دینا امانت اور دیانت کا تقاضا سمجھتا ہوں کہ یہاں آنے سے پہلے میں جتنا متاثر تھا یہاں آکر اس میں کچھ کمی آئی ہے آپ حضرات اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کریں کہ آپ ہی اس دیگ کے وہ چاول

ہیں جنہیں دیکھ کر کوئی شخص دیگ کے متعلق رائے قائم کرے گا۔[1] اس لئے جماعت کی خیر خواہی کا بھی یہ فرض ہے کہ آپ حضرات اپنے آپکو ایسا بنائیں کہ یہاں آکر آپ سے ملنے والا آدمی آپ کو اسلام کا اور اسلامی دعوت کا نمونہ دیکھے۔ میں تعین کے ساتھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ آپ کے کون کون سے پہلو زیادہ قابل اصلاح ہیں، آپ خود ہی سوچیں اور اپنا فرض ادا کریں۔ مولانا مودودی نے جہاں تک مجھے یاد ہے اس کے جواب میں فرمایا تھا، ہاں مجھے احساس ہے کہ مجھے اپنے آپ کو بہت بدلنے کی ضرورت ہے لیکن میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ باہر کی تبدیلی اندر کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اور اس کے تقاضے سے ہو۔

جماعت اسلامی کی اسی مجلس شوریٰ میں دستور پر نظر ثانی کی گئی۔ اور یہ کام ہم تین کے سپرد کیا گیا۔ ایک یہ عاجز، ایک مولانا اصلاحی، ایک مولانا ابوالحسن علی ندوی شاید ان دونوں حضرات کو بھی یاد ہو کہ جو بھی چھوٹی بڑی ترمیمیں اس وقت اس میں کی گئیں وہ سب میں نے کی تھیں اور ان دونوں دوستوں نے ان سے اتفاق کیا تھا، بعض اور معمولی معمولی ترمیمیں جن کے لئے میری رائے تھی، ان کو ان دوستوں نے ضروری نہیں سمجھا اور میں نے بھی ان پر اصرار نہیں کیا

لاہور سے مرکز کی منتقلی کا فیصلہ

اسی مجلس شوریٰ میں غالباً میری اور مستری محمد صدیق صاحب[2] مرحوم کی تجویز بلکہ اصرار پر یہ طے ہوا کہ جماعت کا مرکز لاہور نہ رہے بلکہ ہم کسی جگہ اپنی ایک ایسی نوآبادی قائم کریں جس کو اپنے نظریات کے مطابق تا امکان ایک مثالی دینی بستی بنا سکیں اور جماعت کے جو ارکان منتقل ہو سکتے ہوں وہ وہیں

---

[1] مولانا امین احسن کے یہ خط کشیدہ الفاظ مجھے کچھ اس طرح یاد رہ گئے ہیں کہ مجھے امید ہے کہ ان میں کوئی لفظ بھی میرا نہ ہوگا۔

[2] (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

منتقل ہو جائیں خود میں نے بھی اپنے متعلق یہی فیصلہ کیا کہ میں وہیں منتقل ہو جاؤں گا. بعض اہم مصالح کے پیش نظر سیالکوٹ کا علاقہ اس کے لئے زیادہ مناسب سمجھا گیا ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ اس علاقہ میں جگہ کا انتظام اگر جلدی نہ ہو سکے تو پھر عارضی طور پر "دارالاسلام" کو مستقر بنانے کے لئے چودھری نیاز علی خاں صاحب سے بات کی جائے۔ چودھری صاحب موصوف سے اس عاجز کے اور مستری صاحب مرحوم

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)۔۔۔۔ | مستری محمد صدیق مرحوم | یہ مستری محمد صدیق صاحب "جماعت اسلامی" میں ایک مثالی درویش قسم کے بزرگ تھے۔ غالباً جماعت کے ارکان میں سب سے زیادہ معمر بھی تھے، اصطلاحی عالم دین نہیں تھے مگر قرآن مجید سے ان کو عشق تھا، بہت غور اور تدبر و تفکر کے ساتھ تلاوت کرتے تھے، نماز اتنی اچھی پڑھتے تھے کہ ایسی نماز پڑھنے والے اس عاجز نے اپنی عمر میں چند ہی دیکھے ہیں، اللہ کے کلمہ کی سربلندی اور اس راہ میں جانبازی اُن کی سب سے بڑی تمنا تھی ــــ تحریک خلافت کے آغاز میں بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جو ایک جماعت "حزب اللہ" کی تشکیل کی تھی جس کے لئے وہ لوگوں سے بیعت لیتے تھے، ان مستری صاحب نے اس دعوت پر بھی لبیک کہہ کے مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ مولانا آزاد نے تو مایوس ہو کر یا کچھ سوچ سمجھ کے اس تحریک کو ختم کر دیا لیکن مستری صاحب کے دل میں وہی جذبہ موجزن رہا اسی وجہ سے انھوں نے مولانا مودودی کے مضامین سے متاثر ہو کر ان کی دعوت پر بھی لبیک کہا، وہ جماعت کے رکن نہیں بلکہ گویا اس کے بانیوں میں تھے جماعت اسلامی کا مرکز جب لاہور سے "دار الاسلام" منتقل ہوا تو وہ بھی وہیں آ گئے، ــــ پھر "جماعت" سے جب اس عاجز نے تعلق ختم کر دیا (جبکی تفصیل آگے آرہی ہے) تو کچھ مدت کے بعد مستری صاحب نے بھی علٰحدگی اختیار کر لی. جس کی تفصیل راقم سطور کے علم میں نہیں ــ آخر میں انھوں نے اپنے قدیمی مسکن "سلطان پور لودی" (ریاست کپورتھلہ پنجاب) کے قبرستان میں جھونپڑا ڈال کر رہائش اختیار کر لی تھی، ملک کی تقسیم کے سلسلے میں جو خونی ہنگامے ہوئے اس میں کسی ظالم نے ان کو گولیوں سے گھائل کر دیا (مسلسل)

کے بہت اچھے تعلقات نہ تھے اس لئے ہم دونوں کو پوری امید تھی کہ چودھری صاحب بخوشی اس کے لئے تیار ہو جائیں گے، پھر ایسا ہی ہوا کہ سیالکوٹ کے علاقہ میں جو جگہ زیر غور تھی یا تو وہ حاصل نہ ہو سکی یا کسی وجہ سے اس کا خیال چھوڑ دیا گیا، بہرحال جب چودھری صاحب سے "دار الاسلام" کیلئے مراسلت کی گئی تو وہ آمادہ ہو گئے۔

جماعت کا مرکز دار الاسلام میں

غالباً جمادی الآخری کا مہینہ تھا جب مولانا مودودی مع اپنے دفتر کے لاہور سے پھر "دار الاسلام" آ گئے اور "دار الاسلام" جماعت کا مرکز بن گیا مستری صاحب مرحوم بھی وہیں آکر مقیم ہو گئے۔ دو تین دوست اور بھی آ گئے، مجھے منتقلی کے انتظامات میں کچھ دیر لگی۔ اس لئے میں غالباً دو تین ہفتے بعد پہنچ سکا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے اس سفر کو ایک طرح کا سفر ہجرت سمجھتا تھا۔ اور مجھے اللہ کی اس توفیق پر خاص مسرت تھی۔

دار الاسلام پہنچ کر میرے لئے ایک عظیم مسئلہ

میرے قیام کو ابھی ایک ہی ہفتہ گزرا ہو گا کہ میرے سامنے بعض چیزیں ایسی آئیں جن سے معلوم ہوا کہ احکام شریعت کی جس درجہ کی پابندی، یا کہنا چاہیئے کہ جس درجہ کا عملی تقویٰ جماعت کے ہر رکن کے لئے شرط لازم قرار دیا گیا ہے خود مولانا مودودی نے اپنے کو ابھی تک اس کا بھی پابند نہیں بنایا ہے اور یہ کہ جماعت کی تاسیس سے چند روز پہلے والی تنہائی کی گفتگو سے تقویٰ اور شریعت کی پابندی کے بارے میں مولانا کا جو حال میں نے سمجھا تھا۔ واقعہ میں ان کا حال وہ نہیں ہے بلکہ اس بارے میں ان میں اس قدر تہاون اور

(مسلسل) اس کے بعد وہ پاکستان تشریف لے گئے، علاج معالجہ کے بعد صحت یاب ہو گئے اور پھر کچھ مدت کے بعد وہیں وفات پائی۔ اللّٰھمّ اغفر لہٗ وارحمہٗ

اتنی سہل انگاری ہے جو مقام تقویٰ کے بالکل منافی ہے ــــ یہ معلوم کرکے دل کو سخت دھکا لگا اور میں بار بار غور کرکے اس معاملہ میں نہ تو کسی طرح ان کو معذور سمجھ سکا اور نہ ان کے رویہ کی کوئی تاویل ہی کر سکا۔[1]

---

[1] اب سے ۲۲ سال پہلے رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ کے "الفرقان" میں جب راقم سطور نے اپنی یہ سرگزشت لکھی تھی تو یہ بات اسی طرح بلکہ ان ہی الفاظ میں ادا کی گئی تھی ـ اس سے زیادہ صراحت اور وضاحت مناسب نہیں سمجھی گئی تھی ــ اس وقت مولانا مودودی کے بعض فدائین نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا تھا اس کا تقاضا تھا کہ خواہ دل پر اور طبیعت پر جبر کرنا پڑے، وہ اصل واقعہ لکھدیا جائے جو میرے لئے اس احساس اور تاثر کا خاص سبب بنا تھا دلی تکلیف کے ساتھ اب حوالۂ قلم کر رہا ہوں۔ (یہ بھی واضح رہے کہ یہ واقعہ کوئی راز نہیں ہے جس کا افشا کیا جا رہا ہے۔ اس دور میں دارالاسلام میں جتنے حضرات مقیم تھے سب کے علم میں ہے۔)

وہ واقعہ جس نے مجھے جھنجھوڑ کے رکھدیا۔

جس دن راقم سطور "دارالاسلام" پہنچا تھا اس کے اگلے ہی دن کسی نماز کے بعد مسجد ہی میں مولانا مودودی صاحب نے موجودہ رفقائ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ کسی اسلامی بستی کے لئے ایک "محتسب" بھی ضروری ہے اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ ذمہ داری آپ لیں! ــــ میں نے کہا کہ ابھی تو ہم چند ہی آدمی ہیں، ایسے میں کسی محتسب کی کیا ضرورت ہے۔ــ مولانا نے فرمایا۔ اس کی بنیاد ابھی سے پڑنی چاہئے۔ بہرحال مجھے "محتسب" بنا دیا گیا اور یہ بات بھی اسی مجلس میں ذکر میں آگئی کہ میری یہ ذمہ داری ہے کہ اس پر نگاہ رکھوں کہ ہمارے اس دائرہ میں کوئی بات شریعت کے خلاف نہ ہو۔

میرے قیام پر دو چار ہی دن گزرے تھے کہ غالباً کسی رفیق جماعت کے ذریعہ میرے علم میں یہ بات آئی کہ مولانا کا باورچی (جو جوان العمر تھا) زنانخانے میں کھانا پکاتا ہے اور اس سے پردہ نہیں ہے اور یہ کہ دارالاسلام کے مقیم رفقائ پر اس کا اثر برا پڑ رہا ہے پہلے تو میرا دل و دماغ اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ میں سوچتا تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے (مولانا کی کتاب "پردہ" اس سے بہت پہلے

اب میرے سامنے ایک سخت مشکل اور الجھن آگئی اور وہ یہ کہ جماعت کی تاسیس کے وقت مولانا مودودی کی امارت کی تحریک خود میں نے پیش کی تھی اور سب کے سامنے میں نے اپنے اس اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ مولانا موصوف اپنے علم و عمل اور اپنی فکری صلاحیتوں کے لحاظ سے جماعت کی امارت کے لئے موزوں ترین آدمی ہیں اور ان شرطوں کے جامع ہیں جو دستور میں امیر کے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں[1] پھر اس کے بعد الفرقان کے صفحات پر بھی میں اپنے اس علم و اطمینان کا برابر اظہار کرتا رہا، یہ گویا میری طرف سے مولانا کے بارے میں ایک شہادت تھی جو میں نے اس وقت کے اپنی معلومات کی بنا پر ادا کی تھی۔ اب دارالاسلام میں مولانا کے ساتھ چند روز قیام کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کا حال وہ نہیں ہے جو ان کے بتلانے سے میں نے سمجھا تھا اور

شائع ہو چکی تھی) لیکن بالآخر معلوم ہو گیا کہ واقعہ یہی ہے ۔۔۔ اس واقعہ کے علم نے مجھے ہلا کے اور جھنجھوڑ کے رکھ دیا، غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہو گی کہ اب تک جس ماحول میں میری زندگی گزری تھی اس میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی بھی درجہ کے تقوے اور دیندارانہ زندگی کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے ۔۔۔ جماعت کے دستور میں "صفِ اوّل" کے ارکان کے بارہ میں لکھا ہوا تھا کہ ۔۔۔۔:

"ان لوگوں کے لئے احکامِ شرعیہ کی پابندی کے معاملہ میں کوئی رعایت نہ ہو گی، ان کو مسلمان کی زندگی کا پورا نمونہ پیش کرنا ہو گا اور ان کے لئے رخصت کے بجائے عزیمت کا طریقہ ہی قانون ہو گا۔"

[1] دستور میں امیر کے لئے جو صفات ضروری قرار دیگئیں تھیں ان میں "علمِ دین میں بصیرت" اور اصابت رائے سے بھی پہلے "تقویٰ" کا ذکر تھا۔

جس کا میں نے بار بار اپنے زبان و قلم سے اظہار کیا ہے۔ اب میں محسوس کرتا تھا کہ اس نئے علم و انکشاف کے بعد بھی اسی طرح میرا رکن جماعت بنا رہنا ایک ایسی عملی شہادت ہے جس کا غلط اور خلاف واقع ہونا مجھے معلوم ہو چکا ہے" اور یہ ایک طرح کا نفاق ہے لیکن چونکہ جماعت اسلامی" میں شرکت بڑے بلند عزائم کے ساتھ کی تھی اور اس وقت اُس سے بڑی مقدس آرزوئیں وابستہ تھیں اس لئے یہ شک بھی گزرتا تھا کہ ایسا تو نہیں کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں اس میں شیطانی فریب کا کوئی دخل ہو یا نفس امارہ کا دھوکا ہو۔ میں نے تنہائیوں میں گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کر اس پر غور کیا اور میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ میرے سامنے اس وقت یہ مسئلہ نہیں تھا کہ مولانا مودودی امارت کے اہل نہیں ہیں لہٰذا انہیں امارت سے الگ ہو جانا چاہیئے یا یہ کہ مولانا مودودی کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے جماعت کی شرکت و رکنیت اب جائز نہیں رہی ہے بلکہ میرے سامنے اصل مسئلہ اس وقت صرف اپنی ذات سے متعلق یہ تھا کہ میں مولانا کے بارے میں بار بار ایک شہادت دے چکا ہوں اور اب مجھے معلوم ہوا کہ میری وہ شہادت صحیح اور واقع کے مطابق نہیں تھی، ایسی حالت میں اگر میں بدستور جماعت کا رکن رہتا ہوں تو گویا اپنے عمل سے مسلسل وہ شہادت دیتا ہوں جو اب میرے علم میں سچی شہادت نہیں ہے۔ بس یہ تھی میری اصل مشکل جس کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آیا اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ بعض اور چیزیں بھی اس احساس میں شامل ہو گئیں تھیں لیکن وہ اس درجہ کی نہیں تھیں، سب سے اہم اور بنیادی چیز یہی تھی۔

جماعت اسلامی کے دائرہ سے باہر جو اہل علم اور اصحاب بصیرت میرے اکابر یا احباب تھے ان کے متعلق بس سمجھتا تھا کہ اگر ان سے میں مشورہ کروں تو جماعت کی

اہمیت اور قدر و قیمت اور اس کے مقاصد کی بلندی سے پوری طرح واقف نہ ہونے
کی وجہ سے وہ صحیح رائے نہیں قائم کر سکیں گے اس لئے میں نے اس معاملہ میں مشورہ حاصل
کرنے کے لئے جماعت کے اندر ہی کے دو صاحب علم منتخب کئے۔ ایک مولانا امین احسن
صلاحی اور دوسرے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی میں نے اس پیش آمدہ مشکل کے
بارے میں ایک مفصل خط لکھ کر رجسٹری سے مولانا امین احسن صاحب کے نام اس وقت
کے ان کے مستقر مدرستہ الاصلاح سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) کے پتہ پر روانہ کیا اور
اس میں ان سے اصرار کے ساتھ گذارش کی کہ آپ اس خط کے ملنے کے بعد جلد سے جلد
مولانا علی میاں کے پاس جائیں اور دونوں صاحب غور و فکر کے بعد مجھے مشورہ دیں
کہ اس صورت میں کیا میرے لئے شرعاً اس کی کوئی گنجائش ہے کہ میں خاموشی کے
ساتھ اسی طرح جماعت میں رہوں اور میرے حق میں یہ معصیت نہ ہو یا ایسی حالت
میں میرے لئے یہ ضروری ہے کہ میں اپنی بے اطمینانی ظاہر کر کے جماعت سے بے تعلقی
اختیار کر لوں۔ میں نے یہ خط رجسٹرڈ روانہ کیا تھا اور جواب بھی رجسٹرڈ مانگا تھا
امید تھی کہ ہفتہ تک اس کا جواب مجھے ضرور مل جائے گا، لیکن کوئی جواب نہیں آیا
مجھے یاد ہے کہ وہ دن مجھ پر کتنے سخت گزرے اور میں ان دنوں راتوں میں کتنا رویا ہیں
محسوس کرتا تھا کہ میں سخت آزمائش میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ میرے
ایمان اور میری خدا پرستی کا امتحان ہے بعض وقت سوچتا تھا کہ جب یہ بات کھل کر
سامنے آگئی ہے کہ مولانا مودودی کے بارہ میں میرا اظہار اطمینان اور میری شہادتیں صحیح
اطلاع پر مبنی نہیں تھیں تو مجھے اپنے کو اس سلسلہ سے فوراً الگ کر کے شہادت کی
ذمہ داری سے نکل آنا چاہیئے۔ اور اس بارے میں طبیعت میں جو توقف اور تامل ہے
وہ صرف اس لئے ہے کہ لوگ "بے وقوف" نہ بنائیں ــــ بعض وقت سوچتا تھا کہ اگر
میں نے علحدگی اختیار کی اور اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تو ایک ایسی اسلامی دعوت

اور جماعت کو نقصان پہنچے گا جس کو میں مولانا مودودی کی ان کمزوریوں کے باوجود بھی اس وقت کی بہترین اسلامی دعوت اور جماعت سمجھتا ہوں اور جس کے نقصان کو دین کا نقصان سمجھتا ہوں۔

ان دنوں اور ان راتوں میں میں مسلسل دعا اور استخارہ بھی کرتا تھا، جب دس بارہ دن گزر گئے اور میرے خط کا کوئی جواب نہ آیا[1] تو میں نے مناسب سمجھا کہ یہاں کے مقیم رفیقوں میں سے مستری صاحب سے اپنا راز کھول دوں اور ان ہی سے مشورہ لوں، میں ان کو مردِ مومن اور مثالی درجہ کا مخلص و متقی جانتا تھا۔

الغرض میں نے مستری صاحب کے سامنے اپنی الجھن رکھی، معلوم ہوا کہ وہ خود اسی طرح کی کچھ الجھنوں میں ہیں، بہر حال ان سے مشورہ کے بعد میں نے یہی طے کیا کہ میں اپنے دل کی پوری بات مودودی صاحب کو لکھ دوں چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس زمانہ میں ارکان جماعت میں سے مولانا محمد جعفر صاحب پھلواری کا قیام بھی وہیں تھا یا تو مودودی صاحب کے نام خط لکھنے کے دوران یا خط لکھنے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ مولانا جعفر صاحب پر بھی اپنی رائے ظاہر کر دوں اور مشورہ کروں شاید ان کے ذہن میں کوئی دوسرا راستہ آئے۔ چنانچہ میں نے مولانا جعفر صاحب سے بات کی معلوم ہوا کہ وہ بھی بہت بددل اور مایوس ہو رہے ہیں، بہر حال ان کی رائے بھی یہی ہوئی کہ مودودی صاحب کو یہ پوری بات صفائی سے لکھ دینی چاہیئے بلکہ انھوں نے اصرار کیا کہ اس خط پر میں اپنی طرف سے بھی کچھ لکھوں گا، یاد آتا ہے کہ میں نے وہ خط کئی

---

[1] جواب نہ آنے کا سبب بعد میں خود مولانا امین احسن صاحب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ٹھیک انہیں دنوں میں اگست ۴۲ء کی کانگریس کی تحریک (کوئٹ انڈیا) نے مشرقی یوپی میں ریلوے کے نظام کو بھی درہم برہم کر دیا تھا، اعظم گڑھ کی طرف غالباً کئی ہفتے ٹرین نہیں چل سکی تھی، اس لئے وہ خط ان کو ہفتوں کے بعد ملا۔

دن میں لکھ کر پورا کیا تھا۔ آخر میں مولانا جعفر صاحب نے بھی اس پر اپنی طرف سے ایک سطر لکھی جس کا حاصل غالباً یہ تھا کہ یہی احساسات کچھ میرے بھی ہیں۔ اور بالآخر وہ خط میں نے بڑے رنج اور دکھ کے ساتھ مودودی صاحب کو دے دیا۔

اب جہاں تک یاد ہے غالباً یہ خط میں نے عشاء کی نماز کے بعد ان کو دیا تھا۔ خط بہت طویل تھا (جہاں تک یاد ہے قریباً دس بارہ صفحے کا تھا) صبح کو فجر کی نماز کے بعد ہی مولانا نے مجھے اس کا جواب ایک مفصل خط ہی کی شکل میں دیا۔ لیکن ان کے جواب نے میری اصل مشکل کو حل نہیں کیا اور نہ میری بے اطمینانی میں کوئی کمی ہوئی بلکہ اس خط سے میں نے صرف یہی اثر لیا کہ مولانا قلم کے بادشاہ ہیں اور جو چیز بھی لکھنا چاہیں اس کو بڑے ہی اچھے اور مؤثر انداز میں لکھ سکتے ہیں، اور یہ وہ بات تھی جس کا میں پہلے ہی سے قائل تھا۔ اس کے بعد میں نے خط کتابت کے اس سلسلہ کو آگے بڑھانا بے سود سمجھا اور تنہائی میں خود مولانا سے بات کی اور انہیں بتلایا کہ آپ کے جواب سے میری بے اطمینانی اور پریشانی ختم نہیں ہوئی ہے اور میری مشکل کا کوئی حل مجھے اس سے معلوم نہیں ہوا ہے، میرے سامنے اصل اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے امارت کے لئے آپ کا نام خود پیش کر کے اور اس کے بعد اپنے مضامین میں آپ کے بارے میں اپنا اطمینان بار بار ظاہر کر کے خدا کی مخلوق کے سامنے ایک شہادت دی ہے اور اب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری وہ شہادت صحیح نہیں بلکہ واقعہ کے خلاف تھی، پس ایسی حالت میں اگر میں اسی طرح جماعت کا رکن رہوں تو گویا اپنے عمل سے مسلسل اس شہادت کا اعادہ کر رہا ہوں جس کا خلافِ واقعہ ہونا معلوم ہو چکا ہے، اور جھوٹی شہادت اکبرالکبائر ہے، میں بس اس کے مواخذہ سے بچنا چاہتا ہوں لیکن میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی دین کا علم اور اس کی سمجھ دی ہے اور مجھے آپ سے ذاتی تعلق بھی ہے اس لئے میں بے تکلف پھر آپ سے عرض کرتا

ہوں کہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسی صورت ہو کہ میں جماعت سے بھی بدستور وابستہ رہوں اور اس "شہادت زُور" کے گناہ سے بھی بچ جاؤں تو آپ مجھے بے تکلف بتائیں میری انتہائی خواہش یہی ہے کہ میں جماعت کے ساتھ اسی طرح وابستہ رہوں بس اس کا اطمینان چاہتا ہوں کہ اللہ کے ہاں پکڑا نہ جاؤں گا۔ مولانا نے مجھ سے کچھ بات کی لیکن وہ میرے درد کی دوا نہ تھی، وہ میری اس مشکل کا کوئی حل نہ بتا سکے البتہ ان کے گھر کے جس مسئلہ کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر تھا (یعنی باورچی کا زنانخانہ میں کھانا پکانا اور اس سے پردہ نہ ہونا) اس کے بارے میں کچھ گفتگو ہوئی مولانا نے اس کے کچھ وجوہ واسباب مجھے بتائے لیکن اس گفتگو نے میرے اس احساس کو اور پختہ کر دیا کہ جماعت اسلامی کا رکن بننے کے لئے شریعت کی جس درجہ کی پابندی ضروری قرار دی گئی ہے مولانا نے اپنے حق میں ابھی تک اس کا بھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔[1]

---

[1] اس گفتگو کی بھی کچھ تفصیل اپنے ذوق اور طبیعت پر جبر کر کے اب لکھنا ضروری سمجھتا ہوں میں نے مولانا سے عرض کیا کہ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ کھانا پکانے کے لئے باورچی کی ضرورت ہے لیکن یہ تو ضروری نہیں ہے کہ وہ زنانخانے ہی میں پکائے اور گھر میں اس سے پردہ نہ کیا جائے وہ مکان کے باہری حصہ میں پکا سکتا ہے ــ مولانا نے یہ تو تسلیم فرمایا کہ یہ منکر ہے لیکن عذر یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ چور ہوتے ہیں اس لئے مجبوراً گھر میں آنکھوں کے سامنے پکوانا پڑتا ہے ــــ میں نے عرض کیا کہ یا تو چوری کا تھوڑا سا نقصان برداشت کیا جائے، یا پھر ایسا کیا جائے کہ بجائے موجودہ باورچی کے (جس کا نام غالباً اسمٰعیل تھا) نذیر سے کام لیا جائے اس کے بارے میں تو چوری یا خیانت کا شبہ نہیں ہو سکتا (یہ نذیر غالباً ریاست کپور تھلہ کا ایک نوجوان تھا، ناتعلیم یافتہ یا بہت کم تعلیم یافتہ تھا، بہت نیک اور صالح تھا۔ جماعت سے متعلق تھا اور اسی لئے دار الاسلام آگیا تھا۔ ہم لوگوں کا کھانا وہی پکاتا تھا۔ تو اسی نذیر کے بارے میں میں نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ کھانا پکوانے کے لئے بجائے اسمٰعیل کے نذیر کو ملازم رکھ لیجئے۔ اسمٰعیل ہم لوگوں کا کھانا پکایا کرے گا۔۔۔
(مسلسل)

بہر حال اس گفتگو سے مایوسی اور بے اطمینانی میں کچھ اضافہ ہی ہوا، اور میں نے اس وقت اپنے بارے میں وہی طے کیا جو میں نے اپنے اس خط میں بھی غالباً لکھ دیا تھا، یعنی یہ کہ اس وقت میں "دارالاسلام" سے چلا جاؤں اور یہاں سے ہٹ کر اس مسئلہ پر مزید غور کروں، اور مشوروں سے بھی مدد حاصل کروں۔

دارالاسلام سے اپنے وطن اصلی سنبھل

چنانچہ میں نے یہی کیا اور میں وہاں سے (دارالاسلام سے) اپنے اصلی وطن سنبھل چلا آیا یہ غالباً شعبان ۶۱ھ کی آخری تاریخ تھی، بجائے بریلی کے مجھے سنبھل اس لئے آنا پڑا کہ بریلی کا وہ مکان جس میں میں کرایہ پر رہتا تھا وہ میں نے خالی کر دیا تھا اور ایک دوسرے صاحب نے اس کو کرایہ پر لے لیا تھا، نیز دارالاسلام روانہ ہوتے وقت بہ اثنائے کا ضروری سامان (اثاث البیت) بھی میں نے ختم کر دیا تھا بعض چیزیں جو قابل فروخت تھیں وہ فروخت کر دی گئی تھیں، باقی چیزیں دوستوں یا ضرورتمندوں کو دیدی تھیں۔ اہلیہ کو میں نے اپنے اصل وطن والدین کے پاس سنبھل بھیج دیا تھا اور ان سے کہدیا تھا کہ دارالاسلام میں رہائش کے ضروری انتظامات کے بعد میں تم کو آکر لے جاؤں گا۔ مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ کی عمر اس وقت ۱۴/۱۵ سال ہی ہوگی۔ وہ بریلی کے مدرسہ "مصباح العلوم" میں کافیہ، مرقاۃ المنطق وغیرہ پڑھ رہے تھے میں ان کو اپنے ساتھ ہی "دارالاسلام" لے گیا تھا، تاکہ وہاں کے خاص دینی اور تحریکی ماحول میں ان کا

(مسلسل)

..... مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ نذیر سے کھانا پکانا نہیں آتا، اس سے کام نہیں چل سکتا۔ (یہ واقعہ ہے کہ بیچارہ نذیر بہت اچھا کھانا پکانا نہیں جانتا تھا)

مولانا کے ساتھ اس گفتگو کا مجھ پر جو اثر پڑنا چاہیئے تھا وہی پڑا اور یہ گفتگو ہی "اونٹ کی کمر کا آخری تنکا" ہوگئی۔

لیکن میرا غالب گمان یہ ہے کہ "دارالاسلام" سے میرے چلے آنے کے بعد مولانا نے اس منکر کا ازالہ فرما دیا ہوگا۔ حاشیہ

نشوونما ہو اور وہ مولانا مودودی اور دوسرے جماعتی رفقائے سے بھی مستفیض ہو سکیں۔

—— میں نے ارادہ کیا تھا کہ وہاں میں ان کو کتابی اسباق خود ہی پڑھاؤں گا اس کے لئے وہ کتابیں جوان کو پڑھنی تھیں ساتھ لے لی تھیں، ان کتابوں میں مشہور درسی کتاب "شرح تہذیب المنطق" بھی تھی وہ غالباً بھول سے ساتھ نہیں رکھی جا سکی۔ دارالاسلام پہنچکر جب عتیق الرحمٰن سلمہٗ کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے مولانا مودودی سے ذکر کیا کہ کوئی لاہور یا امرتسر جانے والا ہو تو عتیق الرحمٰن کے لئے مجھے "شرح تہذیب" منگوانی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ تو میرے ہاں ہو گی —— مجھے یہ سنکر تعجب ہوا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ انھوں نے ہمارے مدرسوں کے طریقہ پر درس نظامی کے راستہ سے تعلیم حاصل نہیں کی ہے، جس میں منطق کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں —— بہرحال مولانا اُٹھے اور انھوں نے گھر میں سے "شرح تہذیب" لاکر مجھے دی —— میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے "شرح تہذیب" پڑھی تھی؟ انھوں نے بتلایا کہ میرا قصہ یہ ہے کہ میرے والد صاحب ریاست حیدرآباد میں وکالت کرتے تھے، زندگی کے آخری دور میں ان پر دینداری اور فکرِ آخرت کا غلبہ ہوا، میں ان کی چھوٹی اولاد تھا، انھوں نے میرے بارے میں طے کیا کہ وہ مجھے دینی تعلیم دلوائیں گے اس کے لئے انھوں نے ایک مولوی صاحب کو با تنخواہ رکھا وہ مجھے گھر ہی پر پڑھاتے تھے، میں ابتدائی صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھ چکا تھا، شرح تہذیب بھی پڑھ چکا تھا کہ والد صاحب انتقال فرما گئے۔ پھر میرا وہ تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہ سکا —— اسی سلسلہ میں مولانا مودودی صاحب نے یہ بھی ذکر کیا، کہ پھر جب میرا قیام دہلی میں رہا (یہ غالباً "الجمعیۃ" کی ادارت کا دور ہو گا) تو مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی اس زمانہ میں مدرسہ فتحپوری دہلی میں ترمذی شریف پڑھاتے تھے تو میں ترمذی شریف کے ان کے سبق میں شرکت کرتا تھا۔[1]

[1] مولانا مودودی صاحب کے بعض تذکرہ نویسوں نے دہلی کے بعض اور علماء سے بھی انکے علمی اور دینی استفادہ کا ذکر کیا ہے

دارالاسلام کے چند روزہ قیام میں مولوی عتیق الرحمٰن کی تعلیم اور اس کے ضمن میں خود مولانا مودودی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذکر تو جملۂ معترضہ کے طور پر درمیان میں آگیا، ورنہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ میں مولانا مودودی صاحب سے وہ آخری گفتگو کرنے کے بعد جس کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے، دارالاسلام سے سنبھل چلا آیا۔ لیکن اس واقعہ سے مجھے اتنا سخت رنج اور صدمہ ہوا کہ شاید ہی عمر میں اس سے پہلے اتنا بڑا کوئی صدمہ ہوا ہو

نئی صورت حال سے شدید رنج و صدمہ

اس رنج و صدمہ کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ جماعت اسلامی میں شرکت اور پھر "دارالاسلام" کو ہجرت اسوقت کے میرے خاص حالات میں میری زندگی کا بہت بڑا فیصلہ تھا جس کے بارے میں میرا یہ یقین تھا کہ میں نے اللہ کی رضا کے لئے یہ قدم اٹھایا ہے اور شاید یہی عمل میری نجات کا ذریعہ بن جائے اور اب میں ایسی مشکل میں پھنس گیا تھا کہ

یا تو جماعت سے بدستور تعلق قائم رکھتے ہوئے جھوٹی شہادت کا مجرم بنوں اور اپنے عمل سے یہ جھوٹی شہادت مسلسل ادا کرتا رہوں یا جماعت سے الگ ہونے کا فیصلہ کروں جو میرے لئے اسوقت نہایت مشکل اور طبعی طور پر نہایت تکلیف دہ فیصلہ تھا۔ دوسری وجہ اس رنج اور صدمہ کی یہ بھی تھی کہ مولانا مودودی سے میرا ایک گہرا ذاتی تعلق تھا اور میں بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ اس نے ایک طبعی محبت کی شکل اختیار کر لی تھی یعنی ایک راہ کے رفیق یا رہنما ہونے کے علاوہ میرے لئے وہ ایک محبوب دوست بھی تھے اس لئے میرے ان کے درمیان اس طرح کی باتیں پیدا ہو جانا میرے لئے بہت بڑا سانحہ تھا۔

بہرحال ان دونوں وجوہ سے مجھے اس واقعہ سے سخت ترین صدمہ پہنچا اور عالم اسباب میں غالباً اسی صدمہ کا اثر تھا کہ دو ہی چار دن بعد میں بیمار پڑ گیا، بیماری برابر بڑھتی گئی اور دو دن تو ایسے گذرے کہ تیمارداروں کو زیست کی امید بھی کم تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر زندگی عطا فرمائی۔

غالباً بعد رمضان مولانا نے خط کے ذریعے اطلاع دی کہ ان نئے حالات کی وجہ سے جماعت کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہونا فوراً ضروری ہے اور اس میں تمہاری شرکت بھی ضروری ہے۔ میں نے لکھ دیا کہ میں ان دنوں اتنا سخت مریض رہا ہوں کہ سفر کے قابل نہیں ہوں، مولانا نے مجھے لکھا کہ پھر یہ ہوسکتا ہے کہ پوری مجلس شوریٰ سنبھل آجائے اور وہیں اجلاس ہو۔ میں نے غالباً لکھا کہ اپنی وجہ سے میں سب حضرات کو اتنی زحمت دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ اس لئے آپ مجلس شوریٰ جہاں مناسب سمجھیں بلا لیجئے، اگر میں اس وقت تک سفر کے قابل ہوسکا تو انشاء اللہ پہنچ جاؤں گا۔

بہر حال مجلس شوریٰ کا اجلاس دہلی میں بلایا گیا، میں اس وقت مرض سے تو نجات پا چکا تھا لیکن ضعف اتنا تھا کہ یاد ہے کہ سنبھل سے دہلی تک کا پورا سفر میں نے لیٹے لیٹے طے کیا تھا۔ دہلی اسٹیشن پر جب میری ٹرین پہنچی تو چند احباب مجھے لینے کے لئے آئے ہوئے تھے، ان میں ایک دوست "مجسم محبت" شرقی صاحب بھی تھے، انھوں نے ہی مجھے ٹرین سے اتارا اور قیام گاہ پر لے کر چلے۔ شرقی صاحب ارکان جماعت میں سے میرے بھی خاص دوست تھے اور مولانا مودودی کے بھی خاص الخاص قدر دان اور مخلص تھے ان کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ خود ان کا اندازہ یہ ہے اور مودودی صاحب نے بھی ان پر اپنا اندازہ یہی ظاہر کیا ہے کہ دراصل مجھے دارالاسلام کے بعض دوسرے مقیم رفقاء[1] قمر الدین صاحب وغیرہ نے بھڑکایا ہے اور انھوں نے میرے اور مودودی صاحب کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور میں اُن کے بھڑکانے میں آگیا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ بھائی یہ بات بالکل نہیں ہے، میرے جو

[1] دارالاسلام کے مقیم رفقا میں سے مستری صاحب اور مولانا جعفر صاحب کے متعلق تو یہ ذکر پہلے آچکا ہے کہ وہ بھی غیر مطمئن اور دل برداشتہ تھے لیکن ان کے علاوہ جو اور رفیق وہاں رہتے تھے ان میں سے کثر کا حال بھی یہی تھا۔ ان ہی میں سے ایک صاحب بنارس کے قمر الدین صاحب ایم اے بھی تھے۔ یہ غالباً جماعت کے سیکریٹری یا قیم بھی تھے۔

خیالات اور احساسات ہیں۔ وہ خود میرے دل میں پیدا ہوئے ہیں اور صرف اللہ ہی کو علم ہے کہ مجھے اس صورت حال سے کتنا دکھ اور صدمہ ہوا ہے۔ شرقی صاحب نے مجھے مودودی صاحب کا یہ پیغام بھی پہنچایا کہ وہ غور کرکے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جماعت کی موجودہ وحدانی حیثیت ختم کردی جائے۔ پوری جماعت کا کوئی ایک امیر نہ رہے بلکہ جو لوگ ہماری دعوت سے متفق ہیں وہ اپنی اپنی مناسبت اور اعتماد کی بناء پر حلقے قائم کرلیں، اور ہر حلقہ اپنے میں سے جس کو مناسب سمجھے امیر بنالے اور جس کام کو حق سمجھ چکا ہے بنام خدا اس کو کرے۔ میں نے کہا کہ میں ابھی تک بیمار رہا ہوں اس لئے اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکا ہوں۔ دار الاسلام سے آنے وقت میں جہاں تھا وہیں ہوں لیکن اگر مودودی صاحب کی یہی رائے ہو، اور جماعت اس کو بہتر سمجھے تو ایسا کرلیا جائے۔

یہ گفتگو میری اور شرقی صاحب کی تنہائی میں غالباً اسٹیشن سے قیام گاہ جاتے ہوئے ہوئی تھی، اس کے بعد وہ وقت آیا کہ مجلس شوریٰ باقاعدہ شروع ہوئی۔ اپنی سخت کمزوری کی وجہ سے میں نے عرض کردیا تھا کہ مجھے صرف اس وقت بلوا لیا جائے جب میری شرکت خاص طور سے ضروری ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، جب مجلس شوریٰ میں وہ مسئلہ آنے لگا جس کا مجھ سے تعلق تھا تو مجھے بلا لیا گیا اور میں مجلس میں شریک ہوگیا جہاں تک اب یاد ہے پہلے مودودی صاحب نے اس کا اظہار کرکے کہ بعض ارکان کو موجودہ امارت پر پورا اطمینان نہیں ہے۔ اپنی طرف سے دو تین تجویزیں رکھیں، غالباً ان میں سے ایک یہ تھی کہ مجلس اگر منظور کرلے تو وہ مستعفی ہوجائیں۔ اور ان کی جگہ کوئی دوسرا امیر منتخب کرلیا جائے اور دوسری شاید یہ تھی کہ بجائے امیر کے دو چار ارکان کا ایک بورڈ بنا دیا جائے۔ اور تیسری تجویز وہ تھی جس کا ذکر مجھ سے شرقی صاحب نے کیا تھا اور بتایا تھا کہ مودودی صاحب ایسا کرنا چاہتے ہیں اور ان کے نزدیک موجودہ صورت میں

یہی سب سے بہتر حل ہے۔

بہرحال مودودی صاحب نے یہ سب تجویزیں مجلس کے سامنے رکھیں، لیکن اس طرح رکھیں کہ دوسروں کے دلوں کا تو مجھے علم نہیں مگر کم از کم مجھے تو ان کے طرز سے صاف محسوس ہو گیا کہ وہ ہر تجویز پیش کرنے کے ساتھ ارکان مجلس کے ذہنوں کو اس کے لئے تیار کرتے جاتے ہیں کہ وہ ان میں سے ہر تجویز کو جماعت اور اس کے مقدس مقصد کے لئے مضر بلکہ مہلک سمجھیں اور اس لئے لامحالہ اسے رد کر دیں

خود میرا یہ حال تھا کہ چونکہ میں ابھی تک اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا اس لئے میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس مجلس میں خاموش رہوں گا چنانچہ میں خاموش رہا۔ البتہ جب اس تجویز پر گفتگو ہوئی کہ کسی دوسرے کو امیر منتخب کر لیا جائے تو مجھ سے کہا گیا کہ تم اس ذمہ داری کو قبول کر لو، میں نے عرض کیا کہ میں اب سے بہت پہلے جماعت اسلامی کی تاسیس سے بھی پہلے اپنے کو خوب ناپ تول کر یہ رائے قائم کر چکا ہوں کہ ایسی کسی جماعت کا امیر بننے کے میں لائق نہیں ہوں ۔ یاد آتا ہے کہ مجلس کی وہ نشست ختم ہونے کے بعد بھی نجی طور پر مجھ سے اس بارے میں گفتگو کی گئی اور بعض مخلص احباب نے زیادہ اصرار کیا اور جب میں نے اپنے اسی عذر کا اعادہ کیا اور اپنے بارے میں پھر وہی بات کہی جو میں مجلس میں بھی کہہ چکا تھا تو انھوں نے فرمایا کہ ہماری سمجھ میں آپ کی یہ بات بالکل نہیں آتی کہ آپ امارت کے لائق نہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ یہ حدیث تو آپ کے علم میں ہوگی، کہ حضرت ابوذر غفاری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا انی اراک ضعیفاً فلا تولین علی اثنین [۱] (او کما قال) ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر کی جس کمزوری کا ذکر فرمایا ہے اس سے آپ کی مراد جسمانی کمزوری تو تھی نہیں بلکہ کسی خاص صلاحیت کی کمی مراد تھی تو واقعہ یہی ہے

[۱] اے ابوذر! میں تم میں کوئی خاص کمزوری دیکھتا ہوں اس لئے میری تاکید ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ تم دو آدمیوں کے بھی حاکم بنائے جاؤ۔ ۱۲ م

کہ میں نے اپنے کو بار بار تول کر یہی رائے قائم کی ہے کہ مجھ میں بعض اُن صلاحیتوں کی کمی ہے جو اتنی بڑی ذمّہ داری قبول کرنے کے لئے ضروری ہیں اس لئے میں اپنے متعلق یہی فیصلہ کئے ہوئے ہوں کہ امیر بننے کے لائق میں نہیں ہوں۔ اور مجھے اس بارے میں اطمینان ہے کہ اللہ کے نزدیک بھی اس فیصلہ پر میں معذور سمجھا جاؤں گا۔ بہر حال امارت سے متعلق اس خاص گفتگو کے علاوہ میں مجلس کی اس پوری کارروائی میں خاموش اور صرف سامع اور مشاہد رہا اور اس کی وجہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہی تھی کہ میں اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا علاوہ ازیں مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر بات چلی تو ممکن ہے کسی منزل پر ان چیزوں کا تذکرہ صراحت کے ساتھ آجائے جن کی صراحت میں اس وقت کسی طرح مناسب نہیں سمجھتا تھا حتیٰ کہ خود مولانا مودودی کو جو خط اس سلسلہ میں میں نے لکھا تھا اس میں بھی میں نے اُن چیزوں کی صراحت نہیں کی تھی بلکہ یاد آتا ہے کہ "تقوے کی محسوس کمی" جیسے مبہم الفاظ لکھ دیئے تھے جن کا منشار اور مصداق خود مولانا تو سمجھ سکتے تھے یا دارالاسلام میں ساتھ رہنے والے رفقاء شاید کچھ سمجھ سکتے تھے لیکن دوسرے حضرات نہیں سمجھ سکتے تھے (بلکہ میں نے اس خط کے بارے میں بھی مولانا سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کو اپنے ہی تک رکھیں)۔

الغرض جماعت کی مجلس شوریٰ کے اس جلسہ میں جتنی دیر کے لئے میں شریک ہو سکا اس میں بھی صرف سامع اور مشاہد ہی رہا کیونکہ میں اس وقت تک اپنے بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا البتہ دارالاسلام کے مقیم رفقاء میں سے قمرالدین صاحب وغیرہ بعض ارکان نے (جو مولانا مودودی کے حال اور طرزِ عمل سے جماعتی کام کے بارہ میں اپنی مایوسی اور بے اطمینانی ظاہر کر چکے تھے) مولانا موصوف کی پیش کی ہوئی آخری تجویز سے اپنا اتفاق ظاہر کیا اور ایک حد تک اس کی کوشش کی کہ مجلس اس کو منظور کر لے لیکن مجلس کی اکثریت نے اس کو قبول نہیں کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ جماعت کے نظام

میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے اور جو لوگ اپنی بے اطمینانی کی وجہ سے اس نظام کے ساتھ رہنا پسند نہ کریں وہ چاہیں تو اپنے کو نظام جماعت سے الگ کر کے کام کریں۔

اس فیصلہ کے بعد قمر الدین صاحب مولانا جعفر صاحب اور غالباً ان کے ہم خیال اور بھی ایک دو ارکان نے جماعت سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور وہیں اس کا اظہار بھی کر دیا۔

یہ مسئلہ جب اس طرح ختم ہو گیا تو میں نے اپنی کمزوری کی وجہ سے مولانا مودودی اور دوسرے دوستوں سے عرض کیا کہ اب اگر میری کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو مجھے واپسی کی اجازت دے دی جائے، ان حضرات نے اجازت دے دی اور میں سنبھل واپس آ گیا اور اپنے بارے میں یہی عرض کر آیا کہ اس وقت تک تو میں اسی جگہ ہوں جہاں رمضان سے پہلے دارالاسلام میں تھا اور اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں البتہ اتنا میں اب بھی عرض کرتا ہوں کہ خود میری انتہائی خواہش یہی ہے کہ میں اسی طرح جماعت سے متعلق رہوں، اس بارے میں میرے لئے جو خاص مشکل اور الجھن پیش آ گئی ہے اگر اس کا کوئی حل میری سمجھ میں آ گیا تو میں انشاء اللہ یہی فیصلہ کر دوں گا اور اطلاع دے دوں گا۔

بہرحال میں ان حضرات سے اجازت لے کر چلا آیا اور مجلس کی کارروائی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ چند روز بعد لکھنؤ سے مولانا علی میاں کا خط مجھے ملا، اس میں انھوں نے دوسری باتوں کے ساتھ مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ تمہارے چلے جانے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے تمہارا وہ خط مجلس کو سنایا جو تم نے ان کو لکھا تھا اور اپنا جواب بھی سنایا مولانا علی میاں نے اپنے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگرچہ خود میں نے تو جماعت سے وابستہ ہی رہنے کا فیصلہ کیا ہے[1] لیکن تمہارا خط سُن کے دل میں تمہاری محبت اور وقعت

[1] یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد مولانا علی میاں نے اپنے کو جماعت اسلامی سے الگ کر لیا تھا لیکن ان کی علٰحدگی کا میرے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ مجھے ان کی علٰحدگی کا علم بھی بہت عرصہ کے بعد ہوا تھا

اور زیادہ بڑھ گئی۔

مولانا علی میاں کے اس خط سے یہ معلوم کر کے کہ مولانا نے میرا خط میرے آنے کے بعد مجلس میں پیش کیا، مجھے افسوس اور دکھ ہوا۔ اگر انکو مجلس میں پیش کرنا تھا تو میری موجودگی میں پیش کرنا چاہئے تھا

کچھ عرصہ کے بعد جب بیماری کے اثرات ختم ہوئے اور تندرستی و توانائی کچھ لوٹ آئی تو میں نے اپنے مسئلہ میں بعض ایسے حضرات سے مشورہ کرنے کے لئے جن کو میں اس کا اہل سمجھتا تھا مستقل سفر کیا۔ اس مشورہ اور ذاتی غور و فکر کے بعد میری رائے یہ قائم ہو گئی کہ اس غلط شہادت کی ذمہ داری سے نکلنے کے لئے میرے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنی بے اطمینانی ظاہر کر کے میں جماعت سے ضابطہ کا اپنا تعلق توڑ دوں لیکن میں نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ صراحت اور تفصیل سے میں ان باتوں کو بھی بیان کر دوں جو میری بے اطمینانی اور آخر کار اس قطع تعلق کا باعث ہوئی ہیں اس کے بعد میں نے جماعت سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا اور دلی رنج و قلق کے ساتھ اپنے اس فیصلہ کی اطلاع میں نے مولانا مودودی صاحب کو ایک خط کے ذریعہ دی[۱] اس وقت تک میرے اور مولانا موصوف کے درمیان جو بات چیت اور جو خط کتابت اس سلسلہ میں ہوتی رہی اس میں پوری خوش گواری رہی لیکن اس اطلاع کے بعد مولانا کا جو خط آیا اس کا رنگ بالکل دوسرا تھا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مولانا کو یہ وہم ہو گیا کہ اب جب کہ میں نے جماعت سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے تو جیسا کہ ایسے موقعوں پر دنیا میں عام طور پہ ہوتا ہے شاید میرا

[۱] یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دہلی میں ہونے والی اس مجلس شوریٰ کی روداد خود مولانا مودودی صاحب نے مرتب کر کے شائع کی تھی، افسوس ہے کہ اس میں انھوں نے ایک خاص سیاسی قسم کی مصلحت سے واقعہ کے بالکل خلاف یہ ظاہر کیا تھا کہ میں نے بھی اسی مجلس شوریٰ میں قمر الدین خان صاحب وغیرہ کے ساتھ جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اصل واقعہ وہ تھا جو راقم سطور نے یہاں لکھا ہے ۱۲۔

رویّہ بھی بدل جائے گا اور جن باتوں کے اظہار سے اب تک میں بچتا رہا ہوں اب میں ان کے برملا اظہار و اعلان پر آمادہ ہو جاؤں گا۔ اور پھر ان کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کہوں گا اور لکھوں گا ـــ بہرحال جہاں تک میں سمجھ سکا اس موہوم خطرہ کے انسدادہی کے لئے انھوں نے وہ خط مجھے ایسے انداز میں لکھا اور اس کے ذریعہ گویا مجھے خبردار کیا کہ اگر ضرورت اور مصلحت داعی ہو تو وہ کن حدود تک جا سکتے ہیں، اس خط سے مجھ پر یہ چیز اور بھی زیادہ واضح ہو گئی کہ مولانا میں "سچی دینداری کی کتنی کمی ہے اور تقویٰ اور فکرِ آخرت کی نہایت موثر دعوت دینے کے باوجود ان صفات کے لحاظ سے خود ان کا حال اور مقام کیا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو وہ عام دنیا دار اور ناخدا ترس لیڈروں اور صحافیوں کی سطح پر بھی آسکتے ہیں ـــ لیکن میں نے اس کو بھی ان کی بس ایک افسوسناک کمزوری "ہی سمجھا اور اپنے لئے جس رویّہ کا فیصلہ کیا تھا اس پر قائم رہا اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی، اس وقت میں اس کے لئے تیار نہیں تھا کہ میری کسی بات سے جماعت کی اصل دعوت کو نقصان پہنچے اور اس کی ہوا خیزی ہو۔

اس کے بعد میں نے اپنی بے اطمینانی اور علحدگی کے بارے میں "الفرقان" میں بھی ایک مختصر نوٹ "اپنے متعلق ایک اطلاع" کے زیر عنوان لکھ دیا اور اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ جماعت کی اصل دعوت اور مقصد کے ساتھ مجھے اب بھی اتفاق ہے اور میری ہمدردیاں اس کے ساتھ باقی ہیں۔

الفرقان کا وہ نوٹ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے، ناظرین کرام اس کو بھی پڑھ لیں :ـــــــــ

اپنے متعلق ایک اطلاع

احباب کرام کو معلوم ہے کہ اب سے قریباً پونے دو سال پہلے

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے زیر قیادت و امارت جو ایک "جماعت" بنی تھی یہ عاجز مدیر "الفرقان" بھی اس میں شریک تھا اور اس "جماعت" و "دعوت" کے تعارف اور مقاصد کی توضیح و تشریح کے سلسلہ میں "الفرقان" میں بھی کافی لکھا تھا پھر یہ عاجز جماعت کے موجودہ مرکز و مستقر (بستی دارالاسلام) ہی میں چلا بھی گیا تھا اور خیالات و عزائم اس سلسلہ میں اس سے کچھ آگے بھی تھے۔ بعض خاص احباب کو جن کا کچھ علم بھی ہے۔ لیکن کسی دوسرے سے شکوہ نہیں اپنی ہی حرماں نصیبی کا گلہ مند ہوں کہ اس مرحلہ ہی میں بعض ایسے خلاف توقع امور سامنے آئے کہ جس اطمینان اور جن امید دل اور جن اندازوں کی بنا پر میں نے اس نظام سے وابستگی اختیار کی تھی اور اپنے حق میں یہ فیصلہ کیا تھا ان میں میرے لئے فرق آگیا اور مجھے اپنے معاملہ پر نظر ثانی کرنا ناگزیر معلوم ہوا۔ پھر جتنا غور و فکر میرے لئے ممکن تھا میں نے اپنی دانست میں اس سے پورا کام لینے کے بعد اس نظام جماعت سے اپنے کو علٰحدہ کر لینا ہی ضروری سمجھا اور بالآخر دلی رنج و قلق کے ساتھ اپنے کو الگ ہی کر لیا۔

غلط فہمی نہ ہو۔ میری یہ علٰحدگی کسی اصولی اختلاف کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کا باعث دراصل کچھ شخصی قسم کی چیزیں ہوئی ہیں جن کے باوجود وابستہ رہنا میں نے اپنے لئے صحیح نہیں سمجھا اور ان کا کوئی اطمینان بخش اصلاحی حل بھی میں نہیں پا سکا نیز میری یہ علٰحدگی صرف اس مخصوص نظام جماعت سے ہے یعنی اب میں اس کا باضابطہ "رکن" نہیں رہا ہوں مگر اس کے بنیادی مقصد اور اس کی اصل دعوت کو پہلے ہی کی طرح صحیح سمجھتا ہوں اس لئے اگرچہ جماعت کی باضابطہ شرکت

اور اس کی ذمہ داریوں سے میں سبکدوش ہو چکا ہوں لیکن پھر بھی اس کے اصل مقصد کے ساتھ میری وابستگی ویسی ہی ہے اور میں اللہ پاک سے اس راہ میں جدوجہد کی بیش از بیش توفیق مانگتا ہوں نیز "باضابطہ تعلق" کے بغیر اگر مقصد میں میں کوئی مدد دے سکا تو انشاء اللہ تعالیٰ اب بھی بقدر امکان و وسعت "نصح دینی" اور تعاون علی البر سے دریغ نہ ہوگا۔

ان سطور کے لکھنے کی خاص غرض صرف ان حضرات کو اپنی اس علیحدگی کی اطلاع دینا ہے جو میری باضابطہ وابستگی اور سرگرم وابستگی سے تو واقف تھے لیکن میرے اس جدید فیصلہ کا ان کو علم نہیں ہے اور اس لئے وہ مجھے اس جماعت کا "ذمہ دار خادم" اور "باضابطہ رکن" سمجھ کر ہی معاملہ کرتے ہیں حالانکہ میں اپنی اس حیثیت کو ختم کر کے اس سلسلہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔ بہرحال اس اعلان کی اصل غرض صرف اتنی ہی ہے اس لئے میں نے ان امور کی تفصیل بلکہ ان کی طرف اشارہ بھی ضروری نہیں سمجھا جو میرے لئے فیصلہ کی اس تبدیلی کا باعث ہوئے ہیں عام خیال کے مطابق اس سلسلہ کی تفصیلات کے اظہار کے لئے جو دواعی اور جو محرکات یا موجبات میرے لئے ہو سکتے ہیں جن میں سے بعض یقیناً کچھ اہمیت بھی رکھتے ہیں، غالباً وہ سب ہی میرے بھی سامنے ہیں لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود میرا فیصلہ ابھی تک یہی ہے کہ خیر و مصلحت اپنی ذات کی نہیں بلکہ دین کی ان تفصیلات کے عدم اظہار ہی میں ہے لہٰذا کوئی دوست مزید انکشاف کی امید میں اس بارے میں مجھ سے نجی خط کتابت بھی نہ فرمائیں۔

والمسئول من اللہ تعالیٰ ان یوفقنا لما یحب ویرضیٰ ولا یخزینا فی الدنیا والآخرۃ۔ (الفرقان بابت ربیعین ۱۳۶۲ھ)

یہاں تک جو کچھ قارئین کرام نے پڑھا وہ مولانا مودودی صاحب کے ساتھ اس عاجز کے ربط و تعلق اور پھر ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تاسیس و تشکیل میں سرگرم شرکت اور پھر کچھ عرصہ کے بعد دلی رنج و افسوس کے ساتھ جماعت سے قطع تعلق کی روداد اور سرگزشت تھی، ظاہر ہے کہ میں نے اس سلسلہ میں مختلف مرحلوں پر اپنے بارے میں جو فیصلے اور اقدامات کئے ان میں سے بہت سوں کو جماعت اسلامی کے مخالفین میری بہت بڑی غلطی سمجھیں گے اور جماعت اسلامی کے حضرات ان کو ایمان و اسلام کا عین تقاضا اور بعض دوسرے فیصلوں اور اقدامات کے بارے میں ان دونوں فریقوں کی رائے اس کے بالکل برعکس ہوگی لیکن میں نے واقعہ میں غلط کیا ہو یا صحیح، میری زندگی کے ان سالوں کی روداد و سرگزشت بہرحال یہی ہے، مجھے خود اعتراف ہے کہ اس سلسلہ میں مجھ سے بڑی بڑی غلطیاں ہوئیں لیکن اپنے رب کریم سے جو علیم بما فی الصدور اور ارحم الراحمین ہے، مجھے پوری امید ہے کہ وہ ان غلطیوں پر مجھ سے مواخذہ نہ فرمائے گا۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ۔

جماعت سے قطع تعلّق کے بعد

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ساتھ اپنے تعلّق اور پھر قطع تعلّق کی جو سرگزشت گزشتہ صفحات میں ذکر کی گئی اس سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہو گا، کہ قطع تعلّق کے آخری فیصلہ تک بھی میں نے مودودی صاحب میں کوئی ایسی بات محسوس نہ کی تھی جس کو میں زیغ وضلال یا امّت کے حق میں فتنہ سمجھتا۔ ہاں ایسی عملی کمزوریاں بار بار سامنے آئیں جو میرے نزدیک اُس اعلیٰ مقام سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں جس پر میں ان کو احیاءِ دین و اسلامی انقلاب کی دعوت کے علمبردار "جماعت اسلامی" کے امیر و مرشدعام اور اپنے ایک محبوب دوست کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جیسا کہ معلوم ہو چکا یہ عملی کمزوریاں میرے لئے جماعت سے قطع تعلق کا اصل موجب نہیں بنیں۔ میں خود نہ اُس وقت ایسی عملی کمزوریوں سے پاک تھا نہ اس وقت محفوظ ہوں۔ ظاہر و باطن کے بہت سے گناہوں میں اُس وقت بھی ملوث تھا اور آج بھی ملوث ہوں۔ اگر میرے لئے "شہادت" کا وہ مسئلہ پیدا نہ ہو گیا ہوتا جس کا پچھلے صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے تو صرف ان عملی کمزوریوں کی وجہ سے میں جماعت سے تعلق منقطع نہ کرتا جب کہ میں جماعت کی اصل دعوت کو اس وقت بنیادی طور پر احیاءِ دین اور اسلامی انقلاب ہی کی دعوت سمجھتا تھا، اور مودودی صاحب کی فکر و بصیرت کے بارہ میں جو غیر معمولی حسنِ ظن تھا وہ بھی متزلزل نہیں ہوا تھا۔

جماعت سے ضابطہ کا تعلق ختم کرنے کے بعد بھی میرے دل اور میرے عمل میں طویل مدت تک اس کی خیر خواہی و ہمدردی رہی۔ اور جماعت کے اکثر حضرات کا تعلق بھی میرے ساتھ اخلاص و محبت کا رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے ایک دو واقعے بھی ذکر کر دوں:

جماعت سے قطع تعلق کے غالباً سال ڈیڑھ سال بعد کا واقعہ ہے، میں دہلی گیا ہوا تھا جامع مسجد میں ظہر یا عصر کی نماز پڑھی، وہاں جماعت اسلامی کے چند اہم ارکان سے جو قریباً سب ہی میرے دوست احباب تھے، اتفاقاً ملاقات ہو گئی، ان میں بھائی عبدالعزیز شرقی صاحب بھی تھے جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، ان حضرات سے معلوم ہوا کہ یہاں دہلی میں اس وقت جماعت اسلامی یا اس کی مجلس شوریٰ کا جلسہ ہو رہا ہے، شرقی صاحب اور ان کے ساتھ دوسرے احباب بھی مصر ہوئے کہ میں ان کے ساتھ جلسہ گاہ چلوں میرا چونکہ جماعت کے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رہا تھا اس لئے مجھے جانے میں تکلف تھا میں نے معذرت کی تو شرقی صاحب نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور کہا کہ نہیں آپ کو چلنا ہوگا بہرحال میں نے ان حضرات کی فرمائش کی تعمیل کی جلسہ گاہ یا قیام گاہ پہنچا، مولانا مودودی صاحب اور سب حضرات سے ملاقات ہوئی سب نے بڑی محبت اور مسرت کا اظہار کیا۔ ان میں کئی ایک حضرات نے اس پر بھی اصرار کیا کہ میں پھر "جماعت" میں واپس آجاؤں جہاں تک یاد ہے، اس اصرار میں سب سے زیادہ حصہ مرحوم نصر اللہ خاں عزیز صاحب کا تھا۔ یہ حضرات اس اصرار میں بلاشبہ مخلص تھے، ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ میرے لئے "جماعت" سے قطع تعلق کا موجب کیا تھا، بہرحال میں نے مناسب انداز میں معذرت کر دی۔

اس سلسلہ کا دوسرا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ بہار کے کسی مقام پر (غالباً پٹنہ یا دربھنگہ) جماعت اسلامی کا کوئی اہم اجتماع تھا مولانا مودودی صاحب اور جماعت کے

دوسرے تمام اہم حضرات کو جس ٹرین سے سفر کرنا تھا وہ بریلی ہو کر جاتی تھی۔ جماعت کے مرکز دارالاسلام سے مجھے کسی نے اطلاع دی کہ ہماری ٹرین فلاں دن فلاں وقت بریلی اسٹیشن پہنچے گی، مقصد یہ تھا کہ میں ان حضرات سے اسٹیشن پر ملاقات کرلوں۔ چنانچہ مقررہ وقت پر میں اسٹیشن گیا۔ تھرڈ کلاس کے ایک پورے ڈبہ میں جماعت کے سب ہی اہم ارکان تھے مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا مسعود عالم مرحوم، ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم وغیرہ ــــ مولانا مودودی صاحب کی طبیعت کچھ ناساز تھی، اس لئے وہ اکیلے سکنڈ کلاس میں تھے۔ سب حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے کئی ایک حضرات نے اصرار کیا کہ اسٹیشن کی یہ کھڑے کھڑے کی ملاقات کافی نہیں آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں نے شاہجہاں پور کا ٹکٹ منگوالیا۔ اور ان حضرات کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کچھ دیر کے بعد نماز مغرب کا وقت آگیا، سب حضرات نے اصرار کیا کہ نماز میں پڑھاؤں، میں نے ہرچند معذرت کی اور اصرار کیا کہ آپ حضرات میں سے کسی کو امامت کرنی چاہیئے، لیکن ان سب حضرات نے مجبور کردیا، اور نماز مجھ ہی سے پڑھوائی۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جماعت سے قطع تعلق کے بعد بھی جماعت کے ارباب حل وعقد کا میرے ساتھ اور میرا اُن حضرات کے ساتھ کیسا تعلق رہا ــــ قطع تعلق کے بعد طویل مدت تک میرا حال یہ رہا کہ اگر کوئی صاحب میرے سامنے جماعت اسلامی کے خلاف کوئی بات کہتے اور میں ان سے گفتگو کرنا مناسب سمجھتا تو جماعت کی طرف سے مدافعت اور جوابدہی کرتا ــــ اسی زمانہ میں میرے بعض محترم بزرگوں کی طرف سے مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے بارہ میں سخت رائے کا اظہار کیا گیا تو مجھے یاد ہے کہ میرے اندر اس کے خلاف سخت برہمی پیدا ہوئی اور میں نے اپنے ایک محترم بزرگ کو ایسے انداز اور لب ولہجہ میں خط لکھا جس کی میرے اور ان کے تعلق کی نوعیت میں قطعاً گنجائش نہیں تھی ــــ مجھے ہمیشہ اپنی اس غلطی کا

افسوس رہے گا۔

پھر ایک وقت آیا کہ میں نے محسوس کیا کہ جماعت اسلامی کے حلقہ میں یا کہنا چاہیئے کہ مودودی صاحب کی تحریروں سے متاثر ہونے والوں میں یہ ذہنیت عام طور سے پیدا ہو رہی ہے کہ دین اور اس کے تقاضوں کو اگلوں نے صحیح نہیں سمجھا۔ اب بس مودودی صاحب نے صحیح سمجھا ہے ــــ میں چونکہ اس ذہنیت کو اس وقت بھی بہت بڑی گمراہی اور بڑی سے بڑی گمراہیوں کی جڑ بنیاد سمجھتا تھا ــــ اس لئے اس احساس کے بعد سے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کے متعلق میری رائے اور رویہ میں فرق آگیا اور یہاں سے ذہن نے دوسری طرح سوچنا شروع کر دیا۔

۵۷ء کے سفر پاکستان کے بعد ذہن کی تبدیلی

پھر کچھ مدت کے بعد (۵۷ء کے اواخر میں) میرا پاکستان کا سفر ہوا۔ یہ وہ وقت تھا کہ وہاں کی جماعت اسلامی کے صف اوّل کے ارکان اور ممتاز عمائد کو مودودی صاحب سے سخت اختلاف ہو گیا تھا (اور یہ اختلاف خالص دینی بنیاد پر تھا) اور بالآخر انھوں نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی ــــ یہ تھے غازی عبدالجبار صاحب، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب (مدیر المنبر لائلپور) اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب (حال استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ) اور اسی سطح کے ان کے بعض اور رفقاء۔ مولانا امین احسن اصلاحی بھی ان حضرات کے ہم خیال اور شریک حال تھے۔ لیکن انھوں نے اس وقت تک جماعت سے علیحدگی اختیار نہیں کی تھی، بعد میں انھوں نے بھی جماعت سے تعلق منقطع کر لیا تھا۔[1]

---

[1] یہ صرف صف اوّل کے، بلکہ صف اوّل میں بھی صرف چوٹی کے چند حضرات کے نام یہاں لکھے گئے ہیں ورنہ اس وقت جماعت سے قطع تعلق کرنے والوں کی تعداد ستّر کے قریب تھی۔ جیسا کہ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کے اخبار "المنبر لائل پور" سے معلوم ہوا تھا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ حضرات "جماعت اسلامی کی صف اوّل کے ارباب حل وعقد تھے اور میرے سب جانے پہچانے دوست احباب تھے، اور اس کے اظہار میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ کم از کم راقم سطور کے ذاتی علم وتجربہ میں یہ حضرات دیانت اور تقوےٰ کے لحاظ سے مودودی صاحب سے زیادہ قابل اعتماد تھے (واللہ اعلم باحوال عبادہٖ) — ان حضرات سے ملاقات ہوئی تو اس اختلاف کی پوری تفصیل علم میں آئی جو کچھ ان حضرات نے بتلایا، مختصر الفاظ میں اس کا حاصل یہ تھا — کہ ہم لوگ کچھ عرصہ سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ مودودی صاحب راستہ بدل رہے ہیں۔ ان کے سامنے اب مسئلہ صرف حصول اقتدار کا ہے اور اس مقصد کے لئے عام سیاسی پارٹیوں کی طرح جس وقت جو پالیسی وہ اختیار کرنا مناسب سمجھیں اختیار کرنے پر آمادہ ہیں، چاہے وہ اسلامی اصول وتعلیمات کے کتنے ہی خلاف ہو، وہ اس کو اختیار کریں گے اور اسلام ہی کا نام لے کر اختیار کریں گے اور اس کے لئے ان کو، اگر ضرورت ہوگی تو اسلامی اصول وتعلیمات کی من مانی تشریح کریں گے لیکن ہم لوگ اس کو سخت ضلال اور فتنہ سمجھتے ہیں، ہم نے کوشش کی کہ مودودی صاحب کو اور جماعت کو اس راستہ پر چلنے نہ دیں، مدت تک یہ کشمکش، اندر ہی اندر چلتی رہی لیکن مودودی صاحب اس پالیسی سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور آج کل کے سیاستدانوں کی جیسی چالوں کے ذریعہ انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ہم لوگوں کو ہی جماعت سے الگ ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

راقم سطور نے اپنے امکان کی حد تک ان مختصر الفاظ میں اُن حضرات کے بیان کا حاصل اور خلاصہ عرض کر دیا ہے — ان واقعات کی تفصیل جو ان حضرات سے معلوم ہوئی تھی بہت تطویل طلب اور ایک پورا دفتر ہے — اسی زمانہ میں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے اپنے اخبار "المنبر" میں ان واقعات کو خاصی تفصیل سے لکھا تھا

(اس سلسلہ کے اُن کے بعض مضامین ان ہی دنوں الفرقان میں بھی شائع ہوئے تھے) اس کے بعد "جماعت اسلامی پاکستان" کے ایک بڑے پُرجوش اور باصلاحیت رکن اور مولانا مودودی کے فدائی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے (جو مودودی صاحب کے ساتھ اسی اختلاف کی بنا پر جماعت سے الگ ہوئے تھے) ان ہی واقعات سے متعلق تقریباً ڈھائی سو صفحے کی ایک پوری کتاب "تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے لکھی۔ اس میں "جماعت اسلامی پاکستان" کی اب سے ۲۴/۲۵ سال پہلے کی اس اندرونی کشمکش اور اس سلسلہ کے واقعات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے — لیکن حاصل اور خلاصہ اس کا بھی وہی ہے جو اوپر چند سطروں میں راقم سطور نے عرض کیا ہے۔ اس کے بعد ان ہی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اسی موضوع پر ایک اور رسالہ "نقض غزل" کے نام سے بھی لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ دونوں کتابیں قابلِ مطالعہ ہیں۔

الغرض پاکستان کے اس سفر میں ان حضرات کے ذریعہ جو کچھ علم میں آیا۔ خاص کر مودودی صاحب کے "دینی حکمت عملی" کے فلسفہ کی جو تفصیل معلوم ہوئی۔ اور جماعت کے مزاج اور رُخ کی تبدیلی کے بارہ میں جو کچھ ان حضرات سے سُنا (جس کی بعد کے واقعات و تجربات نے بھی پوری تصدیق و توثیق کی) اس نے دل و دماغ پر پڑا ہوا وہ پردہ پوری طرح اٹھا دیا جو قریباً ۲۵ سال سے مودودی صاحب کی دینی فہم و بصیرت کے بارہ میں حد سے بڑھے ہوئے حسن ظن اور ان کی اسلامی انقلاب کی دعوت کی کشش نے ڈال رکھا تھا۔

میری غلطی کی اصل بنیاد

اپنی اس سرگزشت کے سارے مرحلوں پر غور کر کے راقم سطور اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ مودودی صاحب اور جماعت اسلامی سے تعلق کی غلطی میں کم از کم میری

ذات کی حد تک دو عامل خاص طور سے کارفرما رہے ہیں۔

اوّل۔ تحریکِ خلافت" اور بعض دوسرے محرکات کی پیدا کی ہوئی "اسلامی انقلاب" کی آرزو اور اس کے لئے کچھ کرنے کا قلبی داعیہ، جس کو ۱۹۳۹ء میں شروع ہونے والی "دوسری جنگِ عظیم" کے پیدا کئے ہوئے خاص حالات نے اس کے کچھ امکانات دکھا کر نیز اور مشتعل کر دیا تھا۔

دوسرا ـــ ترجمان القرآن" کے ابتدائی دور کے مطالعہ سے مولانا مودودی کے بارہ میں، میرے قلب و ذہن کا غیر معمولی تاثر اور ان کے ساتھ حد سے بڑھا ہوا وہ حسنِ ظن جو شاید میری فطری اور طبعی کمزوریوں میں سے ہے۔

عربی کا ایک مشہور حکیمانہ مصرع ہے: وعین الرّضا عن کل عیب کلیلۃ اور ایک حدیث میں بھی وارد ہوا ہے: حبّك الشيئ يعمی ويصم۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی چیز کی محبّت آدمی کے قلب و ذہن پر چھا جاتی ہے تو آنکھ اور کان دل کے تابع ہو کر اس پسندیدہ اور مرغوب و محبوب چیز میں کوئی عیب اور خرابی دیکھنے اور سننے کے لائق نہیں رہتے۔

مودودی صاحب کے ساتھ ترجمان القرآن" کے ذریعہ اب سے قریباً نصف صدی پہلے جس طرح ابتداءً تعلق قائم ہوا اور اس کے بعد قلب و ذہن جس طرح ان سے متاثر اور ان کے گرویدہ ہوتے گئے اور پھر ۱۹۴۱ء میں احیائے دین اور اسلامی انقلاب کی ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جماعت اسلامی کی تاسیس کے وقت راقم سطور نے جس طرح سب سے پہلے اس میں شرکت و رفاقت قبول کی اور سمع و طاعت فی المعروف کا عہد کیا، پھر جس جوش و جذبہ کے ساتھ الفرقان کے ذریعہ اور چل پھر کر بھی دوسروں کو اس کی دعوت دی اور اس کو گویا وظیفۂ حیات بنا لیا پھر جس مجبوری سے شدید رنج و قلق کے ساتھ جماعت سے علیحدگی اختیار

کرنی پڑی — اِن سب مراحل کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے — واقعہ یہ ہے کہ اس پوری مدّت میں بلکہ اس کے بہت بعد تک بھی اس عاجز کے قلب و ذہن پر مودودی صاحب اور "جماعت اسلامی" کی دعوت کے بارہ میں حسن ظن یا خوش فہمی کا ایسا غلبہ رہا کہ میری نگاہ نے اس طویل مدّت میں ان کی تحریروں میں کوئی ایسی چیز نہیں محسوس کی جس کو میں امت کے لئے گمراہ کن یا دین میں فتنہ سمجھتا اور اس کو کسی اچھے محمل پر محمول نہ کرسکتا — یہ بات یاد ہے کہ ان کی بعض تحریروں میں بے اعتدالی اور خوارج کی سی شدّت محسوس ہوتی تھی، لیکن میں یہ خیال کرکے اپنے کو مطمئن کرلیتا تھا یا کم ازکم اس کو نظر انداز کردیتا تھا کہ یہ "دعوت" کی زبان ہے "فتوے" کی زبان نہیں ہے۔ یاد آتا ہے کہ مولانا مودودی نے اپنی ایسی تحریروں کے بارے میں یہ بات خود لکھی بھی تھی —

مودودی صاحب کے بعض نظریات جو امّت کے لئے فتنہ بن سکتے ہیں

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں بعض ایسی چیزیں اس وقت بھی موجود تھیں جو امّت کے لئے گمراہ کن اور فتنہ کا باعث بن سکتی ہیں، مگر جیسا کہ عرض کیا، اسلامی انقلاب کی دعوت سے مسحور اور مودودی صاحب کی محبّت اور حسن ظن سے مغلوب ذہن نے اس وقت اس کا ادراک نہیں کیا (وعین الرّضا عن کل عیب کلیلۃ)۔

ان میں سب سے زیادہ سنگین اور خطرناک اس عاجز کے نزدیک ان کا وہ نقطۂ نظر ہے جو قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں (الٰہ، ربّ، عبادت دین) کے بارہ میں اور اس کی بنیاد پر پورے قرآن اور اس کے پیغام کے فہم کے بارہ میں "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" نامی اپنی تصنیف میں انھوں نے پیش کیا ہے — یہ عاجز پہلے اسی کے بارہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ میری مدد

فرمائے اور توفیق دے کہ میں مسئلہ کو اس طرح پیش کر سکوں کہ اوسط درجہ کے اہل فہم بھی سمجھ سکیں اور اتمام حجت کا حق ادا ہو جائے۔

مولانا مودودی کی انتہائی خطرناک غلطی

مولانا مودودی صاحب اپنی اس کتاب کے بالکل شروع میں تحریر فرماتے ہیں :-

"الٰہ، رب، دین، اور عبادت یہ چار لفظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن کی ساری دعوت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اکیلا رب اور الٰہ ہے، اس کے سوا نہ کوئی الٰہ ہے نہ رب، اور نہ الوہیت و ربوبیت میں کوئی اس کا شریک ہے لہٰذا اسی کو اپنا الٰہ و رب تسلیم کرو، اور اس کے سوا ہر ایک کی الٰہیت و ربوبیت سے انکار کر دو۔ اس کی عبادت اختیار کرو، اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اس کے لئے اپنے دین کو خالص کر لو، اور ہر دوسرے دین کو رد کر دو۔" (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، صد ۵)

ان سطروں میں جو کچھ مودودی صاحب نے فرمایا ہے، بلا شبہ حق و صحیح ہے، قرآن کی بنیادی دعوت یہی ہے جو مودودی صاحب نے بیان فرمائی اور بلا شبہ یہ چاروں اصطلاحات ایسی ہی بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

آگے مودودی صاحب اسی سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا، اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ "الٰہ" کے کیا معنی ہیں اور "رب" کسے کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں لفظ ان کی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے، انہیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے ——

اس لئے جب

ان سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا "الٰہ" اور "رب" ہے اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعاً کوئی حصّہ نہیں تو وہ پوری بات کو پا گئے، انہیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم ہو گیا کہ دوسروں کے لئے کس چیز کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ کے لئے کس چیز کو خاص کیا جا رہا ہے، جنہوں نے مخالفت کی، یہ جان کر کی کہ غیر اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے انکار سے کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے اور جو ایمان لائے وہ یہ سمجھ کر ایمان لائے کہ اس عقیدہ کو قبول کر کے ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہو گا۔

اسی طرح "عبادت" اور "دین" کے الفاظ بھی، ان کی بولی میں پہلے سے رائج تھے، ان کو معلوم تھا کہ "عبد" کسے کہتے ہیں، عبودیت کس حالت کا نام ہے، عبادت سے کون سا رویہ مراد ہے۔ اور "دین" کا کیا مفہوم ہے، اس لئے جب اُن سے کہا گیا کہ سب کی عبادت چھوڑ کے صرف اللہ کی عبادت کرو، اور ہر دین سے الگ ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ، تو انہیں قرآن کی دعوت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش نہ آئی، وہ سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے نظام میں کس نوعیت کے تغیر کی طالب ہے۔"

مودودی صاحب اس کے آگے متصلاً تحریر فرماتے ہیں:

"لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہو گیا، اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے

ذوق کی کمی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کے لئے "الٰہ" اور "رب" اور "دین" اور "عبادت" کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے، انہیں دونوں وجوہ سے دور آخر کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے اُن معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے مثلاً لفظ "الٰہ" کو قریب قریب بتوں اور دیوتاؤں کا ہم معنی بنا دیا گیا۔ "رب" کو پالنے اور پوسنے والے یا پروردگار کا مترادف ٹھہرایا گیا۔ "عبادت" کے معنی پوجا اور پرستش کے کئے گئے، "دین" کو دھرم اور مذہب اور (RELIGION) کے مقابلہ کا لفظ قرار دیا گیا۔ "طاغوت" کا ترجمہ بت یا شیطان کیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا۔

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۸-۹-۱۰)

پھر اس تغیرِ حال کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں:

"پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے۔"

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، مطبوعہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند ص ۱۱)

اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودی کو یہ کمال بڑی فیاضی کے ساتھ عطا فرمایا ہے کہ ان کی تحریر پر شوکت اور دینی ادب کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ صاف سیدھی اور سہل الفہم ہوتی ہے۔ اس میں ابہام، پیچیدگی اور رمزیت بالکل نہیں ہوتی، ان کی مندرجہ بالا عبارت

بھی ایسی ہی ہے۔ اِس میں انھوں نے صراحت اور قلم کے پورے زور و قوّت کے ساتھ یہ
چند علمی اور تاریخی دعوے کئے ہیں:

اوّلاً یہ کہ زمانۂ نزولِ قرآن کے سب عرب قرآن کی اِن چار بنیادی اصطلاحات
(الٰہ ، ربّ ، عبادت ، اور دین) کا معنی مفہوم صحیح اور بالکل ٹھیک سمجھتے تھے اس لئے
انھوں نے قرآن کی دعوتِ توحید کا مدّعا اور اس کے لوازم و نتائج کو بالکل صحیح ، اور
ٹھیک سمجھا تھا ، اُن میں سے جنھوں نے قبول کیا (مثلاً صدّیقِ اکبرؓ اور دوسرے صحابہ کرام)
انھوں نے سمجھ کر قبول کیا تھا اور جنھوں نے انکار کیا (مثلاً ابوجہل اور ابولہب وغیرہ کفّارِ
عرب) انھوں نے سمجھ کر انکار کیا تھا۔

دوّم یہ کہ زمانۂ نزولِ قرآن کے بعد کی صدیوں میں ان بنیادی اصطلاحوں کے
معنی بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کا مفہوم نہایت محدود بلکہ مبہم ہو کر رہ گیا۔

سوّم یہ کہ جو لوگ اسلام کی سوسائٹی میں پیدا ہوئے (جن میں اکثر تابعین اور
ان کے بعد کے تو سب ہی ائمہ وعلماء شامل ہیں) وہ ان الفاظ کا وہ مفہوم نہیں سمجھ
سکے جو زمانۂ نزول قرآن میں سمجھا جاتا تھا اور جو صحیح مفہوم تھا۔

چہارم یہ کہ اس تغیّر حال کی وجہ سے قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ
اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی۔

راقم سطور، مولانا مودودی کے ان علمی اور تاریخی دعوؤں اور ان کے دلائل پر اس
وقت کوئی بحث و تنقید اور تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔ عام قارئین سے صرف اتنا عرض کرنا
ہے کہ مولانا نے اپنی اس تحریر کے ذریعہ یہ بات پورے زور و قوّت کے ساتھ اپنے ناظرین
کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن پاک کی ان بنیادی اصطلاحات (الٰہ، ربّ
دین، عبادت) کا مفہوم بس زمانۂ نزول قرآن (یعنی زیادہ سے زیادہ صرف قرنِ اوّل)

میں تو صحیح سمجھا گیا تھا اور اس بنا پر اس کے توحید کے پیغام کو بھی اس زمانہ میں صحیح سمجھا گیا تھا لیکن اس کے بعد اس کو صحیح نہیں سمجھا گیا۔ غلط یا ناقص سمجھا جا رہا ہے، اور اس تغیر حال کی وجہ سے قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم اور اس کی روح امت مسلمہ کی نگاہوں سے مستور رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب کی آیات تسلیم کر لینے کے بعد قرآن کی ساری تعلیم، بلکہ سارا دین غیر مستند، مشتبہ اور ناقابلِ اعتبار ہو جاتا ہے۔ جب الٰہ۔ رب۔ عبادت اور دین جیسے الفاظ، جو قرآن پاک میں یقیناً سیکڑوں جگہ آئے ہیں اور اس کے کم ہی صفحات ایسے ہوں گے جو ان الفاظ سے خالی ہوں ــــ اور قرآنی دعوت و تعلیم میں جن کی وہ بنیادی اہمیت ہے جو یقیناً کسی دوسرے لفظ کی نہیں، جب ان کے متعلق یہ مان لیا جائے کہ زمانۂ نزول قرآن کے بعد کی امت مسلمہ صدیوں سے ان کا، جو مفہوم و مدعا سمجھتی رہی ہے وہ صحیح نہیں ہے، غلط ہے یا ناقص ہے اور اس کی وجہ سے دعوتِ توحید سے متعلق قرآنی آیات اور کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کا مطلب و مدعا بھی غلط یا ناقص سمجھا جا رہا ہے تو پھر قرآن کی کسی آیت اور اس کے کسی لفظ اور کسی کلمہ کے متعلق بھی اطمینان کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان کا وہی مطلب و مدعا ہے جو اب تک جمہور امت سمجھتی رہی ہے ــــ اس کے بعد ملحدین کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے کہ وہ لغت کی کتابوں وغیرہ کا سہارا لے کر زبان و قلم کے زور سے سارے دین کو بدل کے رکھ دیں۔

امید ہے ذیل کی چند مثالوں سے ناظرین اس بات کو بآسانی سمجھ سکیں گے

(۱)

رسول کے معنی و مفہوم کے بارہ میں چکڑالوی حضرات کی بحث:۔

لفظ "رسول" کا مفہوم و مطلب اور اس کی حقیقت امت مسلمہ میں معلوم

معروف ہے۔ ہر وہ شخص جو کلمہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ" پر ایمان لایا ہے اپنی علمی اور ذہنی سطح کے مطابق "رسول" کا مطلب سمجھتا ہے مگر "منکرین حدیث" میں جو لوگ انتہا پسند رہے ہیں (مثلاً مولوی عبداللہ چکڑالوی صاحب اور ان کے متبعین) وہ دعویٰ کرتے تھے کہ عربی زبان میں "رسول" کے معنی بس قاصد اور پیام رساں کے ہیں اور "رسول" کی حیثیت صرف یہی ہے کہ وہ خدا کا پیام اور حکم اس کے بندوں کو پہنچا تا ہے ۔ "رسول" کے بارے میں عام مسلمانوں کا جو تصور اور عقیدہ ہے کہ وہ معصوم ہے اور مفترض الطاعہ ہے وغیرہ وغیرہ، یہ سب بالکل بے بنیاد اور مولویوں کی ایجاد ہے ـــــ اب سے قریباً پچاس سال پہلے ان لوگوں کا ایک پرچہ "بلاغ" امرتسر سے نکلتا تھا اس میں اس موضوع پر مستقل مضامین ہوتے تھے، وہ قرآنی آیات بھی دلیل کے طور پر پیش کی جاتی تھیں جن میں بعض انبیاء علیہم السّلام کی زلّات کا ذکر ہے۔ (مثلاً وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ـ اور فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ـ اور وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وغیرہ) ـــــــــ میرا گمان ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی نظر سے "بلاغ" اور اس کے وہ مضامین ضرور گزرے ہوں گے ـــ ممکن ہے کسی لائبریری میں اس کا فائل بھی محفوظ ہو۔

ظاہر ہے کہ چکڑالیوں کے اس نظریے اور دعوے کی بنیاد اسی پر ہے کہ صدیوں سے امّتِ مسلمہ کے عوام و خواص لفظ "رسول" کا مطلب اور اس کی حقیقت کو غلط سمجھتے رہے ہیں ـــ کیا یہ بات مودودی صاحب کے اس دعوے سے کچھ زیادہ مختلف ہے جو انھوں نے 'الٰہ'، 'رب'، 'عبادت' اور 'دین' کے معنی مفہوم کے بارے میں کیا ہے؟

(۳)

صلوٰۃ (نماز) کے معنی اور اس کی حقیقت کے بارے میں بحث :-

قریباً ۳۵ ـــ ۴۰ سال پہلے کا واقعہ ہے، یہ عاجز بریلی رہتا تھا اور الفرقان

وہیں سے نکلتا تھا، ایک دن ایک صاحب تشریف لائے، یہ پنجاب کے رہنے والے تھے لیکن کسی کاروباری سلسلہ سے ضلع بدایوں میں مقیم تھے، اچھے خاصے پڑھے لکھے تھے، عربی سے بھی آشنا تھے، عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی ___ انھوں نے پہلے مجھ سے نماز کے بارہ میں بات شروع، دریافت کیا، آپ جو نماز پڑھتے ہیں کیا کہیں قرآن میں اس کا حکم یا ذکر ہے؟ ___ میں نے اندازہ کرلیا کہ یہ صاحب چکڑالوی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی روشنی میں ان سے گفتگو کی ___ آخر میں انھوں نے اپنا تصنیف کردہ ایک رسالہ نکال کر مجھ کو دیا، یہ چھوٹے کتابی سائز کے قریباً ۶۰ / ۷۰ صفحے کا رسالہ تھا اس کا نام غالباً "قرآنی نماز" یا اس کے قریب المعنی کوئی نام تھا ___ جہاں تک یاد رہ گیا ہے اس کی بحث کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان جو نماز پڑھتے ہیں اس کا کہیں قرآن میں حکم یا ذکر نہیں ہے یہ "غیر قرآنی نماز" ہے، مولویوں کی ایجاد ہے۔ "صلوٰۃ" کے لغوی معنی دعا ___ مناجات اور توجہ الی اللہ کے ہیں، اس کے لئے انھوں نے لغت کی کچھ کتابوں سے چند عبارتیں بھی نقل کی تھیں، قرآنی آیات بھی پیش کی تھیں۔ خیال ہے کہ ان میں ایک آیت یہ بھی تھی: "صَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ"[۱] ___ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے "الفرقان" میں اس کتاب اور اس کے مصنف اور ان کے اس عجیب و غریب دعوے کا اسی طرح تذکرہ کیا تھا جس کے وہ مستحق تھے۔

ظاہر ہے کہ اس گمراہی کی بنیاد بھی یہی ہے کہ امت مسلمہ کے خواص و عوام "صلوٰۃ" کے جو معنی اور اس کی جو حقیقت اب تک سمجھتے رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، قرآن اور لغتِ عرب کے خلاف ہے۔

(۳)

زکوٰۃ کے بارہ میں ان منکرین حدیث کا دعویٰ:۔

---

[۱] اس آیت میں صلوٰۃ کے معنی دعائے خیر ہی کے ہیں۔
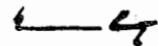
ہفتہ وار "ایشیا لاہور" جماعت اسلامی پاکستان کا سرکاری ترجمان ہے اس کے ۱۷ جون ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں فتنۂ انکار حدیث کے اس دور کے سب سے بڑے علمبردار غلام احمد پرویز کے ماہنامہ "طلوع اسلام" کے ایک مضمون کا تذکرہ کرتے ہوئے (جو اس میں زیر عنوان "زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم" شائع ہوا تھا) لکھا گیا ہے:

"ماہ مئی کے "طلوع اسلام" میں زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

"زکوٰۃ" عربی زبان میں نشوونما کو کہتے ہیں، لہٰذا ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہوں گے، سامانِ نشوونما مہیا کرنا اور یہ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ افراد معاشرہ کی نشوونما کا سامان فراہم کرے اور یہ سامانِ نشوونما صرف روٹی، کپڑا، مکان ہی کو شامل نہیں ہے بلکہ اس میں وہ تمام اسباب وذرائع شامل ہیں جن سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے قرآن کی آیت: "الذین ان مکنّاھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ" کا بھی یہی مفہوم ہے یعنی یہ نہیں کہا کہ جب ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ لوگوں سے زکوٰۃ لیں گے، کہا یہ گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں گے، افرادِ معاشرہ کی نشوونما کا سامان فراہم کریں گے (ملخص)

ایشیا میں "طلوع اسلام" کا یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد قریبًا تین کالم میں اس کی تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس میں "زکوٰۃ" کا جو "قرآنی مفہوم" بیان کیا گیا ہے وہ سراسر تحریف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح اور امت کے اجماع اور تواتر کے خلاف ہے (اور بلاشبہ یہ بات صحیح ہے)

ظاہر ہے کہ رسول۔ صلوٰۃ۔ زکوٰۃ جیسی دینی اصطلاحات کے بارہ میں ان منکرین حدیث کے ان خرافاتی اور انتہائی گمراہ کن دعوؤں کی بنیاد یہی ہے کہ ان دینی اصطلاحات کے جو معنی اور جو حقیقت نزول قرآن کے بعد سے امت مسلمہ کے عوام وخواص سمجھتے

رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، صحیح وہ ہے جو مولوی عبداللہ چکڑالوی اور پرویز صاحب جیسے نئے محققین نے لغت اور خود قرآنی آیات سے سمجھی ہے ۔۔۔ مولانا مودودی صاحب اور ان کے محبین و متبعین، للہ غور فرمائیں ۔ کیا یہ بات اس دعوے سے کچھ کم غلط اور عجیب ہے کہ زمانہ نزول قرآن کے بعد کی صدیوں میں دین کی سب سے اہم بنیادی اصطلاحات (الٰہ، رب، دین، عبادت) کا جو مفہوم سمجھا جاتا رہا وہ صحیح نہیں تھا، غلط یا ناقص تھا، صحیح مفہوم وہ ہے جو چودھویں صدی ہجری کے قریبًا وسط میں مولانا مودودی صاحب نے لغت اور قرآنی آیات سے سمجھا ہے، کاش اللہ تعالیٰ مودودی صاحب کو توفیق دے کہ وہ اس کو محسوس کریں کہ انھوں نے یہ بات لکھ کر فتنہ کا کتنا بڑا دروازہ کھولدیا ہے اور ملحدین کے لئے کیسی سند فراہم کردی ہے۔

چار بنیادی اصطلاحوں سے متعلق مولانا مودودی صاحب کے نقطۂ نظر کے بارہ میں جو کچھ یہاں تک لکھا گیا وہ عوام یعنی غیر علماء کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے، جن بندوں کو اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کے علم کی نعمت سے بہرہ ور فرمایا ہے اور جن کا مبلغ علم صرف اردو کی کتابیں نہیں ہیں اور جو علماء کی اصطلاحات سے واقف ہیں وہ حضرات اس مسئلہ پر اس طرح غور فرمائیں کہ مودودی صاحب کی اس تحقیق و ریسرچ کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ "الٰہ" کے معنی اور "لا الٰہ الا اللہ" کے صحیح مفہوم و مدعا کو امت میں تواتر حاصل نہیں رہا، صدیوں سے اس کلمہ شریف کے معنی غلط یا ناقص سمجھے جاتے رہے۔ اس نتیجہ کی سنگینی کو بیچارے عوام تو شاید نہ سمجھ سکیں لیکن اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا صرف امکان تسلیم کرلینے سے بھی دین کی پوری بنیاد متزلزل ہوجاتی ہے۔ کسی صاحب علم کو اس میں شک نہ ہوگا کہ ہم کسی عقیدہ اور حقیقت پر ایمان لانے کے اسی صورت میں مکلف ہیں جب کہ وہ تواتر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت و منقول ہو ۔۔۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے

کہ عہد نبوی یا قرن اوّل کے بعد کی چند صدیاں یا کوئی ایک صدی یا اس سے بھی کم مدّت ایسی گزری ہے جب کہ امّت میں "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا مفہوم و مدّعا صحیح نہ سمجھا جاتا تھا، غلط یا ناقص سمجھا جاتا تھا تو تواتر باقی نہیں رہتا، تواتر کے لئے بلا انقطاع تسلسل ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا مفہوم اور اس کی حقیقت اور اسی طرح دوسرے بنیادی ایمانی حقائق کا علم صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوا تھا اور صحابۂ کرام سے وہی علم تابعین نے حاصل کیا اور ان سے ان کے تلامذہ تبع تابعین نے اور یہ سلسلہ اِلیٰ یَوْمِنَا ہٰذَا حاملین قرآن اور حاملین دین میں اسی طرح جاری ہے۔ الفاظ و تعبیرات کے فرق کے ساتھ وہی کتب تفسیر اور علمائے محققین کی کتابوں میں ہے ۔۔۔ الغرض صحابہ کرام سے ہم تک صرف "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کے الفاظ ہی نہیں پہنچے ہیں بلکہ ان کا مفہوم و مدّعا بھی تواتر کے ساتھ پہنچا ہے جس طرح "صلوٰۃ" و "زکوٰۃ" کے صرف الفاظ نہیں بلکہ ان کی حقیقت اور ان کا مفہوم بھی تواتر کے ساتھ پہنچا ہے ۔۔۔

واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ الٰہ، رب اور دین و عبادت کے معنی اور کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا صحیح مفہوم و مدّعا زمانۂ نزول قرآن کے بعد کی صدیوں میں نہیں سمجھا گیا، غلط یا ناقص سمجھا جاتا رہا۔ پورے دین کو غیر مستند اور نامعتبر قرار دینا اور ملحدین کے لئے دینی حقائق کی نئی نئی تشریحات و تحریفات کا دروازہ کھول دینا ہے لیکن مودودی صاحب کو جتنا کچھ میں جانتا ہوں اس کی بنا پر میرا گمان ہے کہ انھوں نے سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر یہ انتہائی غلط اور گمراہ کن بات نہیں کہی ہے اُن سے یہ غلطی غیر شعوری طور پر ہوئی ہے ۔۔۔ خود راقم سطور کا واقعہ یہ ہے کہ جن دنوں میں چار بنیادی اصطلاحوں سے متعلق مولانا مودودی صاحب کا یہ مقالہ "ترجمان القرآن"

میں قسطوار چھپ رہا تھا جو بعد میں "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا یہ "جماعت اسلامی" کا پہلا سال تھا تو میں نے مودودی صاحب کی اس تحقیق و تشریح سے اختلاف کیا تھا جو انھوں نے اس مقالہ میں کی تھی اور اس سے اختلاف کا ذکر اپنے اس مضمون میں بھی کر دیا تھا جو مولانا محمد علی کاندھلوی کے اعتراضات اور خدشات کے جواب میں میں نے لکھا تھا جس کا عنوان تھا "جماعت اسلامی کی حقیقت اور ہمارے کام کی نوعیت۔ بعض شبہات کا جواب" (میرے اس جوابی مضمون کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) یہ پہلے الفرقان میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد رجب یا شعبان ۶۱ھ کے "ترجمان القرآن" میں بھی شائع ہوا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ میرا قیام مولانا مودودی صاحب کے ساتھ اُس وقت کے جماعت کے مرکز "دار الاسلام" میں تھا۔ اسی سلسلہ کی اور اسی زمانہ کی یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن ہم ساتھ بیٹھے تھے، میں نے مودودی صاحب سے دریافت کیا کہ "لا الٰہ الا اللہ" کی جو تشریح آپ کرتے ہیں کیا پہلے بھی کسی عالم یا مصنف نے یہ تشریح کی ہے (واضح رہے کہ اُس وقت میرا یہ سوال اعتراض یا کسی بحث کی نیت سے نہیں تھا بلکہ استفسار ہی کے لئے تھا) موصوف نے فرمایا کہ ــــ "بس شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہیں جو کافی دور تک صحیح چلتے ہیں، لیکن قریب پہنچ کر مڑ جاتے ہیں۔

مودودی صاحب کے اس جواب کا آخری خط کشیدہ جملہ (لیکن قریب پہنچکر مڑ جاتے ہیں) مجھے ایسا یاد ہے کہ میرے لئے اس پر قسم کھانا جائز ہے کہ ان کے الفاظ یہی تھے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ خود میرا یہ واقعہ ہے کہ میں قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحوں اور کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کی مودودی صاحب کی خاص تشریح سے متفق نہیں تھا لیکن مجھے اس وقت بلکہ اس کے بعد بھی ایک طویل مدت تک اس کا احساس و شعور

نہیں ہوا کہ یہ صرف علم و تحقیق کی ایک غلطی نہیں ہے بلکہ اس سے ملحدین کے لئے قرآنی نصوص اور دینی اصطلاحات کی ملحدانہ تشریحات و تحریفات کا دروازہ کھل جاتا ہے اور ان کے لئے ایک بڑی سند فراہم ہو جاتی ہے۔

الغرض میرا خیال ہے کہ جس طرح اس وقت مجھے اس کا احساس و شعور نہیں ہوا، اسی طرح غالباً مودودی صاحب کو بھی نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن بعد میں جب اس عاجز کو اس غلطی کی اس سنگینی اور خطرناکی کا احساس ہوا تو میرے ہی مشورہ پر "الفرقان" میں بھی اس سلسلہ میں لکھا گیا اور کئی ایک دوسرے حضرات نے بھی لکھا۔ پھر اب سے چند ہی مہینے پہلے رفیق محترم مولانا علی میاں نے بھی اپنے خاص انداز میں بڑی دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ اس سلسلہ میں لکھا، لیکن افسوس ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے اس کے بعد بھی اس سنگین غلطی کی اصلاح و تدارک کی ضرورت نہیں سمجھی۔ غالباً اس میں بڑا دخل اس بات کو بھی ہے کہ ان کے فیض یافتہ فدائین میں ایسے اصحاب قلم کی اچھی خاصی تعداد ہے جنھوں نے شاید اپنا فریضہ سمجھ لیا ہے کہ جب بھی کوئی شخص مولانا مودودی صاحب کی کسی غلطی کی نشاندہی کرے تو وہ اس کا بھرپور جواب دے کر مولانا موصوف کے لئے اطمینان کا سامان فراہم کردیں اور اپنی قلمی مہارت سے خود اس آدمی کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کردیں۔

آخر میں صرف ایک بات اور عرض کر کے "چار بنیادی اصطلاحوں" سے متعلق اس سلسلۂ گفتگو کو ختم کرتا ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے ایک ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک تصنیف میں مصلحین و مجددین کے تذکرہ میں حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، شاہ اسمٰعیل شہید حضرت سید احمد شہید کے ساتھ سر سید احمد خان دہلوی اور مولوی عبداللہ صاحب

چکڑالوی کا بھی ذکر کیا تھا، مولانا مودودی نے شوال ۱۳۵۹ھ کے ترجمان القرآن میں اس پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا:

ڈاکٹر صاحب نے سرسیّد اور مولوی عبداللہ چکڑالوی کے متعلق جو نوٹ لکھے ہیں وہ نظر ثانی کے محتاج ہیں اوّل تو ان دونوں حضرات کا ذکر مجدد صاحب، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ اسمٰعیل شہید اور سیّد احمد بریلوی کے سلسلہ میں، لانا یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ گویا یہ بھی اسی سلسلہ کے آدمی ہیں۔ دشتان مابین ھؤلاء و ھؤلاء۔ پھر سرسیّد کے کام کو اصلاح اور تنقید عالی کے الفاظ سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ مسلمانوں میں ان کے بعد جتنی اہم مذہبی، سیاسی، اجتماعی، ادبی، تعلیمی تحریکیں اٹھی ہیں ان سب کا سررشتہ کسی نہ کسی طرح انسے ملتا ہے، دراصل مبالغہ کی حد سے بھی متجاوز ہے سچ تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک جس قدر گمراہیاں مسلمانوں میں پیدا ہوئیں ان سب کا شجرۂ نسب بالواسطہ یا بلاواسطہ سرسیّد کی ذات تک پہنچتا ہے، وہ اس سرزمین میں تجدّد کے امام اوّل تھے اور پوری قوم کا مزاج بگاڑ کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ رہے مولوی عبداللہ چکڑالوی تو اُن کو قرآن کا بڑا عالم کہنا قرآن پر ظلم ہے۔" (ترجمان القرآن بابت شوال ۱۳۵۹ھ)

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ سرسیّد احمد خان کے حالات وخیالات سے جو لوگ واقف ہیں اور جنھوں نے ان کی تفسیر قرآن کا مطالعہ کیا ہے، وہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ ان کے جس رویّہ کی بنا پر مولانا مودودی صاحب نے اُن پر سخت تنقید کی ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہونے والی ساری گمراہیوں کا ان کو ذمّہ دار قرار دیا ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے قرآنی الفاظ و دینی اصطلاحات مثلاً ملائکہ، جنات، جنّت، جہنّم و

کی وہ تشریحات کیں اور وہ مطالب و مفاہیم بیان کئے جو ان سے پہلے علماءِ امت اور ائمۂ دین میں سے کسی نے بیان نہیں کئے تھے۔ گویا انھوں نے بھی ان قرآنی الفاظ و اصطلاحات کی نئی تشریحات کر کے یہی دعویٰ کیا کہ ان کا صحیح مفہوم امت میں صدیوں سے صحیح نہیں سمجھا جا رہا تھا، صحیح مفہوم و حقیقت وہ ہے جو میں دلائل کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ الٰہ، رب، دین اور عبادت جیسی دین کی بنیادی اصطلاحات اور صلوٰۃ و زکوٰۃ، ملائکہ، جنات، جنت، جہنم جیسے قرآنی الفاظ و کلمات کے متعلق یہ سمجھنا اور لوگوں کو سمجھانے اور باور کرانے کی کوشش کرنا کہ صدیوں سے جمہور علماء امت ان کا جو مطلب سمجھتے رہے ہیں، وہ غلط یا ناقص تھا اور ان کی نئی تشریحات کرنا ہزاروں گمراہیوں اور دینی فتنوں کی جڑ بنیاد بن سکتا ہے [۱]

ایسی خطرناک غلطی کیوں ہوئی؟

میں نے اس پر بہت غور کیا کہ مودودی صاحب سے ایسی خطرناک غلطی کیوں ہوئی؟ تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ انھوں نے بیسویں صدی کے اس دور میں جب کہ ساری دنیا میں سیاست اور سیاسی اقتدار کے مسئلہ نے دوسرے تمام مسائل سے زیادہ قیامت اور جنت، دوزخ کے مسئلہ سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی اور ہمارے

---

[۱] واضح رہے کہ کسی قرآنی آیت یا کلمہ سے متعلق کوئی نیا نکتہ بیان کرنا یا کسی نئے مسئلہ کا استنباط و استخراج کرنا اور بات ہے اور یہ قرآن پاک کی صفت "لا تنقضی عجائبہ" کا تقاضا ہے اور الٰہ، رب، دین، عبادت جیسی بنیادی اصطلاحات اور کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کی حقیقت اور قرآن کی دعوت توحید یا صلوٰۃ و زکوٰۃ جیسے اصطلاحی قرآنی کلمات کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ زمانہ نزول قرآن کے بعد کی صدیوں میں ان کا مفہوم صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا اور اب چودھویں صدی میں جو بیان کیا جا رہا ہے وہ صحیح مفہوم ہے بالکل دوسری بات ہے۔ اور اس سے یقیناً ان مزلیع کے لئے ملحدانہ تحریفات کا دروازہ کھلتا ہے۔

اس برِصغیر غیر منقسم ہندوستان میں کانگرس اور مسلم لیگ کی متقابل اور متحارب سیاسی تحریکیں زور شور سے چل رہی تھیں گویا ایک سیاسی جنگ عظیم برپا تھی اور قریباً ہر طبقہ کے دلوں، دماغوں پر سیاست ہی چھائی ہوئی تھی تو اس سیاست زدہ فضا اور ماحول میں مودودی صاحب نے اپنی دعوت و تحریک کو خاص کر جدید تعلیمیافتہ نوجوانوں کی نگاہوں میں وقیع اور مقبول بنانے کے لئے ضروری سمجھا کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ، اور عقیدۂ توحید کی اور اس طرح اسلام کی ایک نئی سیاسی تشریح کی جائے [1] اور اسی کو دعوت کی بنیاد بنایا جائے ــــ اس کے لئے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ عقیدۂ توحید سے تعلق رکھنے والی خاص بنیادی اصطلاحوں (الٰہ، رب، عبادت، دین) کی وہ نئی سیاسی تشریح کریں ــــ یہ واقعہ ہے کہ مودودی صاحب بڑے ذہین اور بہت محنتی آدمی ہیں۔ انھوں نے عربی لغت کی کتابیں کھنگال کے اور قرآن سے بھی بہت سی آیتیں نکال کے ان بنیادی اصطلاحات کی نئی سیاسی تشریح پر ایک پورا مقالہ لکھ کر اپنے نزدیک اپنا مدعا ثابت کردیا ــــ اسی کے ساتھ انہیں خود خیال آیا یا کسی نے توجہ دلائی کہ ان بنیادی اصطلاحوں کا جو نیا مفہوم انھوں نے بیان کیا ہے وہ کسی دور کے کسی مفسّر قرآن، کسی شارحِ حدیث اور کسی محقق عالم و مصنّف نے نہیں لکھا اور تنہا یہ بات عام مسلمانوں کے لئے ان کے اس دعوے اور اس تشریح کو ناقابل قبول قرار دینے کے لئے کافی ہے ــــ تو انھوں نے اس کے دفعیہ اور پیشبندی کے لئے اس مقالہ یا رسالہ کا ایک طویل مقدمہ تحریر فرمایا (جس کا بڑا حصہ ان ہی کے الفاظ میں آپ پڑھ چکے ہیں) جس کا

---

[1] انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں دماغوں پر سائنس، مغربی فلسفہ اور نیچر چھایا ہوا تھا تو سر سید احمد خاں نے اس کو اسلام کی خدمت سمجھا کہ قرآن کی تفسیر اور اسلام کی تشریح اس کے مطابق کی جائے پھر انھوں نے اپنی ذہانت اور قابلیت صرف کردی جس کا نمونہ ان کی تفسیر ہے۔ مودودی صاحب کو بھی یہی حادثہ پیش آیا اور انھوں نے اسلام کی نئی سیاسی تشریح و تفسیر کردی۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحات کا مفہوم و مطلب اور اس کی دعوت توحید کو زمانۂ نزول قرآن میں تو صحیح طور پر سمجھا گیا تھا لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان اصطلاحات کے معنی بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ ان کا مفہوم نہایت محدود بلکہ مبہم ہو کر رہ گیا ۔۔۔ اس طرح مودودی صاحب نے گویا اپنے ناظرین کو مطمئن کر دینے کی کوشش کی کہ جو مفہوم و مطلب انھوں نے بیان کیا ہے وہی صحیح ہے اور تفسیر و شرح حدیث وغیرہ کی کتابوں میں جو لکھا گیا ہے وہ غلط یا ناقص یا مبہم و محدود ہے کیونکہ وہ سب کتابیں بعد کی صدیوں میں لکھی گئی ہیں جب ان اصطلاحوں کا مفہوم و مطلب صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ محدود و مبہم ہو کر رہ گیا تھا۔

اور بلاشبہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تفسیر قرآن اور شرح حدیث وغیرہ اسلامی علوم و فنون کی ساری کتابیں بعد کی ان ہی صدیوں میں لکھی گئی ہیں، جن میں بقول مولانا مودودی الٰہ، رب، دین، عبادت جیسی بنیادی اصطلاحات کا مفہوم بھی صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا ۔۔۔ ہمارے تفسیری کتب خانہ کی قدیم ترین تفسیر جو مطبوعہ اور متداول ہے وہ حافظ ابن جریر طبری کی ہے، جن کا زمانہ تیسری اور چوتھی صدی کا ہے۔ باقی ساری تفسیریں جن کو کسی درجہ میں مستند کہا جا سکتا ہے، سب اس کے بعد کی صدیوں کی ہیں جیسے امام محی السنہ بغوی کی 'معالم التنزیل' اور علامہ علی بن محمد بغدادی کی 'لباب التاویل'، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تفسیری رسائل (خاص کر تفسیر سورۂ اخلاص) حافظ ابن کثیر دمشقی کی تفسیر القرآن العظیم، قرطبی، امام رازی، ابو السعود، علامہ بیضاوی اور نسفی کی تفاسیر، خطیب شربینی کی 'السراج المنیر' اور آخری دور کی تفسیروں میں مظہری، 'روح المعانی' اور قاضی شوکانی کی تفسیر 'فتح القدیر'۔

اسی طرح حدیث شریف کی قدیم شروح میں ابن عبد البرؒ اور خطابیؒ کی شروح، اور بعد کے دور میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، علامہ بدر الدین عینیؒ اور قسطلانیؒ کی صحیح بخاری

کی معروف و مقبول شروح، امام نووی کی شرح مسلم، علامہ طیبی کی شرح مشکوٰۃ، پھر دورِ آخر میں علامہ علی قاری کی مرقاۃ، اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی لمعات یہ سب بھی بعد کی ان ہی صدیوں میں لکھی گئی ہیں۔

علیٰ ہٰذا امت کے ممتاز و محقق مصنفین مثلاً امام غزالی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ ان کے شاگردِ رشید حافظ ابن القیم، پھر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب حضرات بعد کی بلکہ بہت بعد کی صدیوں ہی کے ہیں ۔ ان حضرات نے اپنی تصانیف میں توحید کی حقیقت پر اور اس سلسلہ میں آلہ، الوہیت، رب، ربوبیت عبادت اور عبودیت کے معنی مفہوم پر خاص طور سے اور بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے لیکن مذکورہ بالا مفسرین قرآن اور شارحین حدیث کی طرح ان میں سے بھی کسی نے ان بنیادی اصطلاحات کی وہ تشریح نہیں کی اور توحید کی وہ حقیقت نہیں بتلائی جو مودودی صاحب نے اپنے رسالہ " قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں بتلائی ہے۔

بہر حال راقم سطور کا یہی خیال ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے ان بنیادی اصطلاحات کے یہ نئے سیاسی معنے اور قرآن پاک کی دعوتِ توحید کی یہ نئی سیاسی تشریح اس دور کی خاص سیاست زدہ فضا سے متاثر ہو کر اور بالخصوص جدید تعلیمیافتہ طبقہ کو پیش نظر رکھ کر کی اور چونکہ یہ تشریح ان سے پہلے کسی مفسرِ قرآن، کسی شارح حدیث اور امت کے کسی مسلّم و معتمد عالم و مصنف نے نہیں کی، اس لئے انھوں نے یہ کہہ کر کہ ۔ زمانۂ نزول قرآن سے بعد کی صدیوں میں ان بنیادی اصطلاحات کا مفہوم اور دعوتِ توحید کا مدعا صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا، اور جو لوگ اسلام کی سوسائٹی میں پیدا ہوئے وہ ان الفاظ کا وہ مفہوم نہیں سمجھ سکے جو زمانۂ نزول قرآن میں سمجھا جاتا تھا۔ تمام مفسرین، شارحین حدیث اور علماء و مصنفین کو (خاص کر ان اصطلاحات اربعہ اور دعوت توحید کے فہم کے بارہ میں) ناقابلِ اعتماد قرار دے دیا اور اس طرح اپنے لئے اس کا جواز پیدا کر لیا

کہ اِن اصطلاحات اور قرآن کی دعوتِ توحید کی وہ تشریح کریں جو اُن سے پہلے کسی نے نہیں کی۔

جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں مولانا مودودی کو میں جتنا کچھ میں جانتا ہوں اس کی بنا پر میرا یہ گمان ہے کہ اس کے لکھتے وقت اُن کو اس کا شعور و احساس نہیں ہوا کہ میں یہ لکھ کر اہلِ زیغ اور ملحدین کے لئے دین میں تحریف اور فتنہ کا کیسا چوپٹ دروازہ کھول رہا ہوں اور سرسید احمد خان اور مولوی عبداللہ چکڑالوی اور علامہ مشرقی اور پرویز صاحب کی جیسی ملحدانہ تحریفات کے لئے کتنی زبردست سندِ جواز فراہم کر رہا ہوں۔

اگر میرا یہ حسنِ ظن صحیح ہے تو قدیم تعلق کی بنا پر میں مولانا سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اس سے رجوع کا اعلان کر کے فتنہ کے اس دروازہ کو خود ہی بند کر دیں۔ واللہ الموفق

ایک ضروری انتباہ !

واضح رہے کہ دین کی ان بنیادی اصطلاحات اور عقیدۂ توحید کی اس نئی سیاسی تشریح سے دین میں جو گہری معنوی تحریف اور اس کی روح و حقیقت اور اس کے فلسفہ میں جو غیر معمولی تبدیلی ہو جاتی ہے اور اس کا نصب العین تک بدل جاتا ہے، اس پر راقم سطور نے یہاں بالکل گفتگو نہیں کی ہے کیونکہ بعض دوسرے حضرات اس موضوع پر بقدرِ کفایت لکھ چکے ہیں، خاص کر مولانا وحید الدین خانصاحب نے اپنی کتاب "دین کی سیاسی تعبیر" میں اس پر جو روشنی ڈالی ہے وہ قلبِ سلیم رکھنے والوں کے لئے کافی ہے ــــ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو انشاء اللہ آئندہ کسی وقت راقم سطور بھی اس پر تفصیل سے لکھے گا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

★

ایک دوسری ایسی ہی خطرناک غلطی
دین میں
حکمتِ عملی کا فلسفہ

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم بقدر ضرورت اس کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔

جماعت اسلامی جب قائم ہوئی تھی بلکہ اس کے بھی پہلے سے مولانا مودودی کی تحریروں میں احکام شریعت کی پابندی کے بارہ میں ایسی شدت ہوتی تھی کہ اس کی وجہ سے بعض حضرات ان پر خوارج کے مسلک کا الزام عائد کرتے تھے[1] لیکن مولانا مودودی خود اور ہم لوگ بھی اس کی یہ توجیہہ کرتے تھے کہ یہ دعوت کی زبان ہے فقہ یا فتوے کی زبان نہیں ہے ۔ شریعت وسنت کے اتباع کے بارہ میں ان کی انتہا پسندی (یا انتہا پسندی کے مظاہرے) کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد شہید کے اصلاحی و تجدیدی کاموں میں بھی اس لحاظ سے نقائص اور غلطیاں محسوس کرتے تھے ، اور برملا اپنے ان خیالات کا اظہار فرماتے تھے — اور جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے جماعت کے دستور میں دفعہ ۲ کے تحت "صف اول" کے ارکان کے بارہ میں صراحت سے لکھا گیا تھا کہ :

"ان لوگوں کے لئے احکام شریعت کی پابندی کے معاملہ میں کوئی رعایت نہ ہوگی، ان کو مسلمانوں کی زندگی کا پورا نمونہ پیش کرنا ہوگا اور ان کے لئے رخصت کے بجائے عزیمت کا طریقہ ہی قانون ہوگا۔"

یہ بھی بار بار لکھا اور کہا جاتا تھا کہ یہ کام جو ہم لے کر کھڑے ہوئے ہیں، دراصل انبیاء

---

[1] خوارج کا مسلک یہ تھا کہ گناہ کبیرہ کرنے سے آدمی اسلام سے خارج، قطعی کافر اور جہنمی ہو جاتا ہے۔

علیہم السّلام کا کام ہے اس کا راستہ بھی وہی ہے جو انبیاء علیہم السّلام نے اختیار کیا تھا' اس لئے طریق کار میں بھی طریق انبیاء اور احکام شریعت کی پوری پوری پابندی ضروری ہے "جماعت اسلامی" کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مولانا مودودی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مقالہ پڑھا تھا اس کا عنوان تھا "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے"؟ اس مقالہ میں بھی پوری وضاحت اور پورے زور کے ساتھ یہ بات لکھی گئی تھی۔ (راقم سطور اور مولانا علی میاں اور مولانا صبغت اللہ بختیاری بھی مودودی صاحب کے لکھنے پر اس موقعہ پر علی گڑھ پہنچے تھے اور ان کے ساتھ تھے)۔۔۔ الغرض اس زمانے میں اُن کی تحریروں میں اس بات پر بڑا زور دیا جاتا تھا اور اس کو بار بار دہرایا جاتا تھا اور اس کی خاص زد اس وقت مسلم لیگ کی تحریک پاکستان پر پڑتی تھی۔۔ جو اسلام کے نام پر چل رہی تھی' لیکن اسلامی شریعت کے حدود و احکام کی پابندی کا تصور ہی نہیں تھا (اگر اس سلسلہ کی مودودی صاحب کی تحریریں کوئی صاحب یکجا دیکھنا چاہیں تو وہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتاب "تحریک جماعت اسلامی" ملاحظہ فرمائیں ۔۔۔ ایک دو عبارتیں عنقریب ہم بھی نقل کریں گے۔)

اس دور میں ہندوستانی مسلمان عام طور سے دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ایک گروہ مسلمانان ہند کے حق میں مجموعی حیثیت سے اس کو بہتر سمجھتا تھا کہ آزادی کے بعد بھی ہندوستان ایک الگ رہے' صوبوں کی حیثیت خود مختار ریاستوں کی ہو، مرکزی حکومت جمہوری وفاقی طرز کی ہو جس کے پاس خارجہ پالیسی' مواصلات وغیرہ صرف وہ ۴/۳ شعبے رہیں جن کا ملک کی وحدت کے لئے مرکز کے پاس رہنا ضروری ہے ۔۔ اس گروہ میں "جمعیۃ علمائے ہند" اور "مجلس احرار" جیسی جماعتیں شامل تھیں جن کی قیادت علماء اور اہل دین کے ہاتھ میں تھی ۔۔۔ ان کا خیال تھا کہ اس صورت میں ملک کے پانچ صوبوں میں جن کو سرحدی اہمیت حاصل ہے مسلمانوں کی اکثریت ہوگی اور تمام اقتدار ان کے ہاتھ میں

رہے گی اور باقی اُن صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں (مثلاً یو پی، بہار وغیرہ) ان میں بھی مسلمان ہندو اکثریت کے صرف رحم وکرم پر نہیں رہیں گے، ان کو آئینی تحفظات حاصل ہوں گے۔ یہ گروہ تحریکِ خلافت کے زمانہ سے جنگ آزادی میں برابر شریک رہا تھا اور اس کی تاریخ قربانیوں کی تاریخ تھی، اس لئے وہ اس معاملہ میں پُر اعتماد تھا۔

دوسری طرف مسلم لیگ تھی جس کا مطالبہ تھا کہ ملک تقسیم ہو، اور جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ ہندوستان سے الگ ایک آزاد مستقل مملکت (پاکستان) قائم ہو، اور وہاں اسلامی حکومت ہو۔

"مسلم لیگ کی قیادت اگرچہ علماء اور اہلِ دین کے ہاتھ میں نہیں تھی (بلکہ اس کے سب سے بڑے قائد کا بھی عملاً دین و شریعت سے کوئی تعلق نہیں تھا) لیکن "مسلمانوں کی حکومت" اور "اسلامی حکومت" کے نعرہ میں عام مسلمانوں کے لئے بڑی کشش تھی اس لئے ان کی اکثریت نے مطالبۂ پاکستان کی تائید و حمایت کی اور فی الحقیقت اس میں بہت زیادہ دخل ہندوؤں کی تنگ نظری کے تجربہ کا تھا۔

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا موقف اس وقت ان دونوں گروہوں سے صرف الگ ہی نہیں بلکہ دونوں کے سخت خلاف تھا اور مولانا نے ان دونوں پر بڑی بے رحمی سے تنقید کر کے دکھلایا تھا کہ یہ دونوں جن راہوں پر چل رہی ہیں یہ قطعاً غیر اسلامی ہیں بلکہ اسلامی مقاصد و مصالح کے لئے تباہ کن ہیں ـــ ان میں سے پہلے گروہ (جمعیۃ العلماء وغیرہ) پر تنقید سے تو وہ جماعت اسلامی کی تاسیس و تشکیل سے پہلے ہی فارغ ہو گئے تھے۔ جماعت کے قیام کے بعد ان کی تنقید کا خاص رخ مسلم لیگ اور اس کی قیادت ہی کی طرف رہا۔ اس سلسلہ میں جن باتوں پر مودودی صاحب خصوصیت سے زور دیتے تھے ان میں سب سے اہم بات یہی ہوتی تھی کہ اسلامی حکومت اسلامی طریقوں سے ہی قائم ہو سکتی ہے مسلم لیگ کی تحریک کی گاڑی جس غیر اسلامی راستہ پر چل رہی ہے اس کے نتیجے میں

اگر مسلمانوں کی کوئی حکومت قائم ہو بھی گئی تو وہ "اسلامی حکومت" ہرگز نہ ہوگی بلکہ اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے قیام میں وہ غیر مسلم حکومت سے زیادہ مشکلات پیدا کرے گی۔ اس سلسلہ کی ان کی کم از کم دو تین عبارتیں یہاں نقل کرنا ضروری ہے ان عبارتوں کے مطالعہ کے بعد دینی حکمت عملی کے انکے فلسفہ کا پس منظر صحیح طور پر سمجھا جاسکے گا۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں ٹونک (راجستھان) میں جماعت اسلامی کا ایک اہم اجتماع ہوا تھا، اس موقعہ پر کسی صاحب کی طرف سے دو سوال کئے گئے تھے، ان صاحب نے یہ تسلیم کر کے سوال کئے تھے کہ مسلم لیگ کی تحریک پاکستان اور اس کا پروگرام غیر اسلامی ہے۔ ان سوالوں میں دوسرا سوال یہ تھا کہ:

"اس وقت برطانیہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے سپرد کر رہا ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ہندوؤں کا حصّہ ہندوؤں کے حوالے کیا جائے اور مسلمانوں کا حصّہ مسلمانوں کے حوالے کیا جائے، اور دوسری یہ کہ پورے ملک کی باگ ڈور اکثریت یعنی ہندوؤں کے حوالے کر دی جائے، ظاہر ہے کہ اگر آپ نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا تو غیر مسلم اکثریت سارے ملک پر اور مسلمانوں پر مسلط ہو جائے گی۔"

امیر جماعت مولانا مودودی صاحب کی طرف سے اس کے جواب میں فرمایا گیا تھا:

"ان سوالوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی اس قومی تحریک کا ساتھ دیا جائے اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں تو پھر ان کا ساتھ چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ اسے تو سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے...... جب آپ، ایک

تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے......"

جواب کے آخر میں فرمایا گیا تھا:

"اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔ اگر لوگ اسلام اور اسلامی طریق کار کو اپنی خواہشات نفس کے خلاف پا کر ان کو ترک کر دینا چاہتے ہیں تو ہیر پھیر کے راستوں سے آنے کے بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اللہ و رسول کا کام چھوڑیے اور ہمارے نفس کے کام میں حصہ لیجئے۔" (روئداد جماعت اسلامی)

مولانا مودودی صاحب کے ایک مقالہ "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کا ذکر ابھی اوپر آ چکا ہے اس میں مولانا موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں........ عمر بن عبدالعزیز جیسا زبردست فرماں روا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لئے تیار نہ تھی............ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہو گا، وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔

جمہوری حکومت میں اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو، ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں اگر وہ اُس بے لاگ عدل اور اُن بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو اُن کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے، اس ذریعہ سے تو اقتدار ان ہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں تو چاہے مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات اور طریقۂ کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو، اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر کیونکہ وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہو اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہو گی جتنی غیر مسلم حکومت ہو سکتی ہے"۔ (اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے)

(ناظرین کرام سے گذارش ہے کہ وہ مودودی صاحب کی مندرجہ بالا عبارت کو ایک دفعہ اور پڑھ لیں۔)

اس سلسلہ کی صرف ایک عبارت اور پڑھ لی جائے۔ ۱۹۵۷ء میں پٹنہ میں جماعت اسلامی کا اجتماع ہوا تھا، اس میں جماعت اسلامی کے اہم رکن اور ترجمان ملک نصراللہ خان عزیز صاحب نے جماعت اسلامی کے موقف اور طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"اگر آپ فی الواقع نظام اسلامی کے قیام کے خواہاں ہیں تو پہلے اپنے آپکو

اور اپنے لوگوں کے دلوں کو بدلئے۔ وہ دل ان جسموں کو بدلیں گے جن میں وہ دھڑک رہے ہوں گے اور پھر وہ اجسام اپنے گھروں اور خاندانوں اور بستیوں اور شہروں کو بدلیں گے جن میں وہ رہتے ہوں گے، اُن کی صورتیں، ان کی سیرتیں، ان کے معاملات، تعلّقات، سیاست، تجارت، معاشرت اور تمدن ہر شئے بدلتی جائے گی تا آنکہ وہ ایک ایسی سوسائٹی اور جماعت بن جائیں گے کہ ان کے اندر کسی دوسرے نظریۂ زندگی کا عملاً چلنا محال اور ناممکن ہو جائے گا اور وہ نظامِ اسلامی وجود میں آئے گا جس کی ہر چیز اسلامی اور ہر جُزسر تا پا اسلام ہو گا۔ اسلامی نظام ہمیشہ اسی طریقہ پر قائم ہوا ہے اور آئندہ جب کبھی قائم ہو گا اسی طرح ہو گا جو لوگ اس کے سوا کسی دوسرے طریقہ کو بھی اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ سخت دھوکہ میں ہیں اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے اس دھوکہ کو جلد از جلد دور کریں۔ (روداد جماعت اسلامی حصّہ پنجم)

(تحریک جماعت اسلامی۔ از ڈاکٹر اسرار احمد)

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے فیصلہ سے پہلے تک مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کا موقف یہ تھا جو مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوا اور وہ اس پر بڑی شدت سے قائم تھے۔ پھر جب ملک کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا اور پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا تو خود مولانا مودودی اور ان کے رفقاء اور جماعت کا مرکز بھی دار الاسلام سے (جو ضلع گورداسپور میں واقع تھا) پاکستان (لاہور) منتقل ہو گئے۔

یہاں پہنچکر جو صورتِ حال سامنے آئی تو مولانا کا طرزِ فکر بدلنے لگا۔ اور پچھلے چند سالوں میں سینکڑوں صفحات میں جو کچھ انھوں نے لکھا تھا اُس سب کو بھول کر یا بھلا کر خالباً وہ سوچنے لگے کہ جس طرح مسلم لیگ نے "اسلام" اور "اسلامی حکومت" کا

صرف نعرہ لگا کر الیکشن کی جنگ میں جمیعۃ العلماء اور مجلس احرار جیسی جماعتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی اکثریت کی تائید و حمایت حاصل کر لی اور پاکستان بنوالیا، اسی طرح ہم بھی "اسلامی نظام" اور "اقامت دین" اور "حکومت الٰہیہ" کے نام پر الیکشن میں مسلمانوں کی تائید حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح حکومت ہمارے ہاتھ میں آجائے گی اور پھر ہم اس کو صحیح معنی میں "اسلامی حکومت" بنالیں گے ۔۔۔ بہرحال اس امید پر الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا گیا[1] اور اس پہلے مرحلہ پر یہ بھی طے کیا گیا کہ ہم الیکشن اسلامی اصول واحکام کی پابندی کے ساتھ لڑیں گے اور دکھلادیں گے کہ الیکشن اسلامی احکام کی پابندی کے ساتھ اس طرح لڑا جاتا ہے۔

معلوم ہوا تھا کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلا فیصلہ یہ کیا گیا کہ حکومت کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور شریعت کا اصول ہے کہ "طالب الولایۃ لا یولّٰی" (جس کا مطلب ہے کہ جو شخص کسی حکومتی عہدہ یا منصب کا خود طالب و خواہشمند ہو اس کو وہ عہدہ اور منصب ہرگز نہ دیا جائے) لہٰذا عوام سے کہا جائے گا کہ وہ کسی ایسے امیدوار کو ووٹ نہ دیں جو پارلیمنٹ یا اسمبلی کی ممبری کا خود طالب اور خواستگار ہو، بلکہ ہر حلقہ کے

---

[1] حیرت ہے کہ اس کھلی حقیقت کو (جس کو نابینا بھی دیکھ سکتے تھے) نظر انداز کرنے پر اپنے کو کس طرح آمادہ کر لیا گیا کہ پاکستان کے جن عوام کے ووٹوں کی بنیاد پر الیکشن کا فیصلہ ہونا تھا ان میں غالب اکثریت ان لوگوں کی تھی جو مولانا مودودی کی خاص اصطلاح میں صرف نسلی مسلمان اور مردم شماری کے رجسٹر کے حساب سے مسلمان تھے، ان میں غالب بلکہ غالب ترین اکثریت صلوٰۃ و زکوٰۃ جیسے بنیادی فرائض کے تارکین فساق و فجار کی تھی اور ملحدین اور قادیانیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی اور ان میں سے ہر ایک کے ووٹ کا وہی وزن تھا جو کسی عالم دین، صالح و متقی اور خود مولانا مودودی صاحب کے ووٹ کا تھا۔ یا للعجب! کہاں معیار کی وہ بلندی اور کہاں یہ پستی ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ۔

اہل الرائے اپنے حلقہ کی نمائندگی کے لئے کسی اہل اور دیندار شخص کا خود انتخاب کریں اور اس سے الیکشن میں کھڑے ہونے کی درخواست کریں اور خود اس کو کامیاب بنانے کے لئے جدوجہد کریں۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ کسی ایسی پارٹی سے لیکشنی سمجھوتہ بھی نہ کیا جائے جو الیکشن کی مہم میں اس اصول کی اور دوسرے شرعی احکام وہدایات کی پابندی نہ کرے۔

بہرحال اس نقشے اور منصوبے کے مطابق کچھ حضرات کو الیکشن میں کھڑا کیا گیا اور اس کو اقامت دین اور اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ قرار دے کر اپنے پورے وسائل اور ذہن اور زبان وقلم کی ساری صلاحیتوں کو اس پر لگا دیا گیا۔ لیکن نتیجہ میں حیرت انگیز درجہ میں ناکامی ہوئی جس کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، گویا صفر ہی حصّہ میں آیا

اس کے بعد جب الیکشن کا ایک دوسرا موقعہ سامنے آیا (یہ غالباً وہ تھا جو مارشل لا نافذ ہو جانے کی وجہ سے نہ ہوسکا) تو مولانا مودودی اور ان کی جماعت نے پہلے الیکشن میں ناکامی کے تجربہ کے تقاضے سے اپنے اصول اور طریق کار میں (جو دین وشریعت کی روشنی میں اختیار کئے گئے تھے) تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ دوسری سیاسی پارٹیوں سے الیکشنی سمجھوتے کے سلسلہ میں جو سخت رویّہ پہلے الیکشن کے موقع پر اپنایا گیا تھا اور اس کو از روئے شریعت ضروری قرار دیا گیا تھا اس کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

الیکشن کے ذریعہ حکومتی اقتدار حاصل کرنے کی اس پالیسی کے سلسلہ میں اور بھی بعض ایسے فیصلے اور اقدامات کئے گئے جو شریعت کے اصول واحکام اور خود مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے اس قدیم مسلک ورویہ کے قطعی خلاف تھے جو ملک کی تقسیم سے پہلے اُن کا رہا تھا اور اس کو انھوں نے عین دین قرار دیا تھا۔

پالیسی کی اس تبدیلی اور الیکشن بازی کا ایک یہ بھی نتیجہ ہوا کہ جماعت کا مزاج دین کی حامل وداعی جماعت کے بجائے سیاسی پارٹی والا مزاج بنتا چلا گیا اور اس میں وہی

لوگ بھرتے چلے گئے جن کے لئے اس مزاج میں کشش تھی۔

جماعت کا وہ مخلص عنصر جس کو ابتدائی دور کی دینی دعوت نے کھینچا تھا اور جو اس امید پر آیا تھا کہ جماعت اسلامی کے ذریعہ احیائے دین واقامت دین کی جدوجہد خالص انبیائی طریق پر ہوگی، اس نے کسی حد تک تو (غالباً حسن ظن کی بنیاد پر) پالیسی کی اس تبدیلی کا ساتھ دیا (یا اختلاف نہ کرنے کی گنجائش سمجھی) لیکن جب راستہ کی اور مزاج کی تبدیلی بالکل کھل کر آنکھوں کے سامنے آگئی تو اس عنصر نے اس پالیسی اور طریق کار سے اختلاف کرنا ضروری سمجھا اور اسی وقت سے جماعت میں وہ اندرونی کشمکش شروع ہوگئی جس کا ذکر گزشتہ اوراق میں اپنی سرگزشت کے سلسلہ میں کیا جاچکا ہے۔ اس مرحلہ پر مولانا مودودی نے جماعت کے سامنے "دین میں حکمت عملی" کا فلسفہ پیش فرمایا جس کا حاصل یہ تھا کہ "اقامت دین" جیسے عظیم واعلیٰ مقصد کی جدوجہد کے سلسلہ میں، اگر شریعت کے خلاف کچھ کام کرنے پڑیں تو خود شریعت میں اس کی گنجائش ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کس قدر خطرناک تھی اور سیاسی طالع آزماؤں کے لئے، اس سے دین میں فتنوں کا کیسا دروازہ کھلتا تھا، لیکن مودودی صاحب نے اپنی ذہانت اور زورِ قلم سے اس کو شرعی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش فرمائی۔

مودودی صاحب کے "دینی حکمت عملی" کے اس فلسفہ کے خلاف (جہاں تک راقم سطور کے علم میں ہے) سب سے پہلے ان کے خاص رفیق اور جماعت اسلامی بلکہ اس کی مجلس شوریٰ کے بھی اہم رکن مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب نے اپنے ہفتہ وار اخبار "المنبر لائل پور" میں خاصی تفصیل سے لکھا اس کا عنوان تھا "دین کو تحریک سمجھنے کی ہلاکت آفرینیاں"۔ یہ پورا مضمون مولوی عتیق الرحمٰن کے قلم سے ایک مفصل تمہید اور آخر میں ۶/۷ صفحے کی تعلیق کے ساتھ رمضان المبارک ۷۶ھ کے الفرقان میں بھی شائع ہوا تھا اور اس کے ۴۴ صفحے پر آیا تھا۔ اس زمانہ میں الفرقان کی ادارت عملاً

مولوی عتیق الرحمٰن کے ہاتھ میں تھی۔

اس کے بعد مولانا مودودی نے مئی ۱۹۵۸ء کے "ترجمان" میں "المنیر" اور "الفرقان" کے ان مضامین کے گویا جواب ہی میں ایک اور مضمون لکھا جس میں "حکمت عملی" کے اپنے فلسفہ کے ثبوت میں کتاب وسنّت اور تعامل صحابہ سے گن کر ۹/۱۰ دلیلیں پیش فرمائیں مثلاً یہ کہ قرآن پاک میں اکراہ کی صورت میں زبان سے کلمۂ کفر کہنے کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح اضطرار کی حالت میں مردار کھا لینے کی (بلکہ سور کا گوشت کھا لینے کی بھی) اجازت دی گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ)

واقعہ یہ ہے کہ ذہانت اور زبان وقلم کی طاقت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں ہیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت نہ ہو تو یہ بہت بڑا فتنہ اور ہزاروں لاکھوں بندگان خدا کی گمراہی کا بھی ذریعہ بن جاتی ہیں۔ مودودی صاحب کا یہ مضمون اس کی بڑی عبرتناک مثال تھا، خاص کر سیاسی پارٹیاں "اسلام" اور "اسلامی حکومت" کا نام لے کر مولانا کے ان دلائل کی روشنی میں اپنی سیاسی جدوجہد کے راستے میں ہر حرام کو حلال قرار دے کر استعمال کر سکتی تھیں۔

مولوی عتیق الرحمٰن نے پوری تفصیل سے اس مضمون کا جائزہ لیا اور مولانا مودودی صاحب کی دلیلوں یا غلط فہمیوں کی حقیقت ظاہر کرنا ضروری سمجھا۔ انھوں نے "دین میں حکمت عملی کا مقام" کے عنوان سے الفرقان کے مسلسل چار شماروں میں (ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ سے ربیع الاول ۱۳۷۸ھ تک) لکھا۔ یہ چار قسطیں الفرقان کے ۸۴ صفحات پر آئی تھیں۔

اس سلسلۂ مضمون میں مولانا مودودی صاحب کے دلائل کا تفصیل سے جائزہ لینے اور جواب دینے کے علاوہ ان کے دعوے کا سراسر غلط اور روح دین کے خلاف ہونا بھی کتاب اللہ، اسوۂ نبوی، ارشادات نبوی اور تعامل صحابہ سے ثابت کیا گیا تھا

مودودی صاحب نے ایک سوال کے جواب کی صورت میں مولوی عتیق الرحمن کے اس مضمون کا ترجمان القرآن میں جواب دیا، (اس کا عنوان بھی یہی تھا" دین میں حکمت عملی کا مقام") مولوی عتیق الرحمن نے مودودی صاحب کا یہ پورا جوابی مضمون لفظ بلفظ اپنے جواب الجواب کے ساتھ الفرقان میں شائع کر دیا (یہ جمادی الاخریٰ ۸۷ھ کے شمارہ میں شائع ہوا تھا) اس کے بعد اسی موضوع سے متعلق ایک مضمون مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا بھی الفرقان میں شائع ہوا، یہ قریباً ۴۰/۵۰ صفحے کا مضمون تھا۔

اس موضوع پر الفرقان میں جو مضامین اس زمانہ میں شائع ہوئے تھے، اگر ان کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو اندازہ ہے قریباً ڈھائی تین سو صفحے کی کتاب ہو گی ـــــــ

مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور مولوی عتیق الرحمن کے اس سلسلہ کے مضامین میں بنیادی طور پر یہی خطرہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اگر مودودی صاحب کے حکمت عملی کے اس فلسفہ کو اور ان کے دلائل کو تسلیم کر لیا جائے تو لوگوں کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے کہ وہ "اقامت دین" کی جد و جہد کا نام لے کر شریعت کے مسلمہ حدود و احکام کو پامال کریں۔ جن چیزوں کو اللہ و رسول نے حرام قرار دیا ہے، اقامت دین کی مہم سر کرنے کے لئے ان کو ناگزیر قرار دیکر وہ اپنے لئے ان کو حلال جانیں بلکہ ثواب سمجھ کر استعمال کریں ـــ لیکن اللہ کی شان! مولانا مودودی صاحب نے حکمت عملی کے اس فلسفہ کے تحت خود ہی وہ سب کچھ کر کے دکھا دیا جس کا ان کے ناقدین و معترضین خطرہ اور اندیشہ بتلاتے تھے اور مودودی صاحب کے حامیین و معتقدین کہتے تھے کہ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

آپ اس کی تفصیل معلوم کرنے سے پہلے مولانا مودودی صاحب کا ایک مضمون پڑھ لیجئے جو ستمبر ۵۲ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا اور چونکہ وہ وقت

کے ایک اہم مسئلہ سے متعلق بہت اچھا اور اطمینان بخش مضمون تھا اس لئے اس کو اکتوبر ۱۹۵۲ء کے الفرقان میں بھی شائع کیا گیا تھا، یہاں وہ مضمون الفرقان ہی سے مع اس کے تعارفی اداراتی نوٹ کے نقل کیا جا رہا ہے۔ عنقریب آپکو معلوم ہو جائے گا کہ اس مضمون کا زیر بحث موضوع "دین میں حکمت عملی کے فلسفہ" سے کیا تعلق ہے۔

عورت اور مجالس قانون ساز

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(ماہ اگست کے "ترجمان القرآن" (لاہور) میں مولانا مودودی نے پاکستان کے لئے چند دستوری تجاویز پیش کی تھیں، ان تجاویز پر بعض حلقوں کی طرف سے اعتراضات کئے گئے جن کے جوابات موصوف نے ستمبر کے ترجمان میں دیئے ہیں ان میں ایک اعتراض ان کی اس تجویز پر تھا کہ "عورتوں کو مجالس قانون ساز کا رکن نہ ہونا چاہیئے" اس کے جواب میں جو کچھ موصوف نے لکھا ہے، ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کو الفرقان کے صفحات میں بھی محفوظ کر دیا جائے کیونکہ اس کا تعلق ہمارے اس دور کے ایک اہم سوال سے ہے۔)

" ایک اعتراض ہماری اس تجویز پر کیا گیا ہے کہ "عورتوں کو مجلس قانون ساز کا رکن نہ ہونا چاہیئے" اس باب میں ہم سے پوچھا گیا ہے کہ وہ کون سے اسلامی اصول ہیں جو ان کی رکنیت میں مانع ہیں۔ اور قرآن و حدیث کے وہ کون سے ارشادات ہیں جو ان مجالس کی رکنیت کو مردوں کے لئے مخصوص قرار دیتے ہیں ۔۔۔؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم ان مجالس کی صحیح نوعیت اچھی طرح واضح کر دیں جن کی رکنیت کے لئے عورتوں کے

استحقاق پر گفتگو کی جا رہی ہے۔ ان مجالس کا نام مجالس قانون ساز رکھنے سے یہ غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ ان کا کام صرف قانون بنانا ہے اور پھر یہ غلط فہمی ذہن میں رکھ کر جب آدمی دیکھتا ہے کہ عہد صحابہؓ میں خواتین بھی قانونی مسائل پر بحث، گفتگو، اظہار رائے، سب کچھ کرتی تھیں، اور بسا اوقات خود خلفاء ان کی رائے لیتے، اور اس رائے کا لحاظ کرتے تھے، تو اُسے حیرت ہوتی ہے کہ آج اسلامی اصولوں کا نام لے کر اس قسم کی مجالس میں عورتوں کی شرکت کو غلط کیسے کہا جا سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو مجالس اس نام سے موسوم کی جاتی ہیں ان کا کام محض قانون سازی کرنا نہیں ہے بلکہ عملاً وہی پوری ملکی سیاست کو کنٹرول کرتی ہیں، وہی وزارتیں بناتی اور توڑتی ہیں وہی نظم و نسق کی پالیسی طے کرتی ہیں، وہی مالیات اور معاشیات کے مسائل طے کرتی ہیں، اور ان کے ہاتھ میں صلح و جنگ کی زمام کار ہوتی ہے، اس حیثیت سے ان مجالس کا مقام محض ایک فقیہہ اور مفتی کا مقام نہیں ہے بلکہ پوری مملکت کے "قوّام" کا مقام ہے۔

اب ذرا دیکھئے قرآن اجتماعی زندگی میں یہ مقام کس کو دیتا ہے اور کسے نہیں دیتا۔ سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الرّجال قوّامون علی النّسآء	مرد عورتوں پر قوّام ہیں، بوجہ
بما فضّل اللہ بعضھم علیٰ	اس فضیلت کے جو اللہ نے
بعض و بما انفقوا من اموالھم	ان میں سے ایک کو دوسرے
فالصّالحات قٰنتٰتٌ حٰفظٰتٌ	پر دی ہے اور بوجہ اس کے کہ مرد

لّلغیب بما حفظ اللہ (رکوع ۶)	اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پس صالح عورتیں اطاعت شعار اور غیب کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں، اللہ کی حفاظت کے تحت۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں "قوامیت" کا مقام مردوں کو دے رہا ہے اور صالح عورتوں کی دو خصوصیات بیان کرتا ہے، ایک یہ کہ وہ اطاعت شعار ہوں، دوسرے یہ کہ وہ مردوں کی غیر موجودگی میں ان چیزوں کی حفاظت کریں جن کی حفاظت اللہ کرانا چاہتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ حکم تو خانگی معاشرت کے لئے ہے نہ کہ ملکی سیاست کے لئے، مگر یہاں اوّل تو مطلقاً "الرّجال قوامون علی النساء" کہا گیا ہے، فی البیوت کے الفاظ ارشاد نہیں ہوئے ہیں جن کو بڑھائے بغیر اس حکم کو خانگی معاشرت تک محدود نہیں کیا جا سکتا، پھر اگر آپ کی یہ بات مان بھی لی جائے تو ہم پوچھتے ہیں کہ جسے اللہ نے گھر میں قوّام نہ بنایا بلکہ قنوت (اطاعت شعاری) کے مقام پر رکھا آپ اسے تمام گھروں کے مجموعے یعنی پوری مملکت میں قنوت کے مقام سے اٹھا کر قوّامیت کے مقام پر لانا چاہتے ہیں، گھر کی قوّامیت سے مملکت کی قوامیت تو زیادہ بڑی اور اونچے درجے کی ذمّہ داری ہے۔ اب کیا اللہ کے متعلّق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ ایک گھر میں تو عورت کو قوّام نہ بنائے گا مگر کئی لاکھ گھروں کے مجموعے پر اسے قوام بنا دے گا۔

اور دیکھیے قرآن صاف الفاظ میں عورت کا دائرہ عمل یہ کہہ کر معین کر دیتا ہے کہ

وقرن فی بیوتکن ولا تبرّجن تبرج الجاهلية الاولیٰ (الاحزاب - ۴)	اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹھہری رہو پچھلی دور جاہلیت کے سے تبرج کا ارتکاب نہ کرو۔

آپ پھر فرمائیں گے کہ یہ حکم تو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر کی خواتین کو دیا گیا تھا، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کے خیال مبارک میں کیا نبی (صلعم) کے گھر کی خواتین کے اندر کوئی خاص نقص تھا جس کی وجہ سے وہ بیرون خانہ کی ذمہ داریوں کے لیے نا اہل تھیں؟ اور کیا دوسری خواتین کو اس لحاظ سے اُن پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ پھر اگر اس سلسلہ کی ساری آیات صرف اہل بیت کے لیے مخصوص ہیں تو کیا دوسری مسلمان عورتوں کو تبرج جاہلیت کی اجازت ہے۔ اور کیا انھیں غیر مردوں سے اس طرح باتیں کرنے کی بھی اجازت ہے کہ ان کے دل میں طمع پیدا ہو؟ اور کیا اللہ اپنے نبیؐ کے گھر کے سوا ہر مسلمان گھر کو "رجس" میں آلودہ دیکھنا چاہتا ہے؟

اس کے بعد حدیث کی طرف آئیے یہاں ہم کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ واضح ارشادات ملتے ہیں:۔

اذا کان امراؤکم شرارکم واغنیاؤکم بخلاؤکم وامورکم الی نساءکم فبطن الارض خیر لکم من ظهرها۔ ترمذی	جب تمہارے امراء (ارباب حکومت تمہارے) بدترین لوگ ہوں اور جب تمہارے دولتمند بخیل ہوں اور جب تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں ہوں تو زمین کا پیٹ

عن ابی بکرۃ لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّ اھل فارس ملکوا علیھم بنت کسرا قال لن یفلح قومٌ ولوا امرھم امرأۃً (بخاری، ترمذی)

ابوبکرہ سے روایت ہے کہ جب نبی (صلعم) کو خبر ہوئی کہ ایران والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ نے فرمایا وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیے ہوں۔

یہ دونوں حدیثیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد "الرجال قوامون علی النساء" کی ٹھیک ٹھیک تفسیر بیان کرتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیاست و ملک داری عورت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے رہا یہ سوال کہ عورت کا دائرہ عمل ہے کیا؟ تو نبی کریم (صلعم) کے یہ ارشادات اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

والمرأۃ راعیۃ علی بیت بعلھا وولدہ وھی مسئولۃ عنھم (ابوداؤد)

اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی راعیہ ہے اور وہ ان کے بارہ میں جواب دہ ہے۔

یہ ہے آیت "وقرن فی بیوتکن" کی صحیح تفسیر اور اس کی مزید تفسیر وہ احادیث ہیں جن میں عورت کو سیاست و ملک داری سے کمتر درجہ کے خارج از بیت فرائض و واجبات سے بھی مستثنیٰ کیا گیا ہے۔

الجمعۃ حقٌ واجبٌ علی کلّ مسلمٍ فی جماعۃٍ الا اربعۃ عبدٌ مملوک او امرأۃٌ او صبیٌّ او مریضٌ (ابوداؤد)

جمعہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا حق اور واجب ہے بجز چار کے غلام عورت، بچہ اور مریض۔

ام عطیہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم کو جنازوں کے ساتھ جانے سے روک دیا گیا۔	عن ام عطیۃ قالت نھینا عن اتباع الجنائز (بخاری)

اگرچہ ہمارے پاس اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں مضبوط عقلی دلائل بھی ہیں اور کوئی چیلنج کرے تو ہم انھیں پیش کر سکتے ہیں مگر اول تو ان کے بارہ میں سوال نہیں کیا گیا ہے، دوسرے ہم کسی مسلمان کا یہ حق ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ وہ خدا اور رسول کے واضح احکام سننے کے بعد ان کی تعمیل کرنے سے پہلے اور تعمیل کے لیے شرط کے طور پر عقلی دلائل کا مطالبہ کرے۔ مسلمان کو اگر وہ واقعی مسلمان ہے پہلے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے پھر وہ اپنے دماغی اطمینان کے لیے عقلی دلائل مانگ سکتا ہے لیکن اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے پہلے عقلی حیثیت سے مطمئن کرو، ورنہ میں خدا و رسول کا حکم نہ مانوں گا، تو ہم اسے سرے سے مسلمان ہی نہیں مانتے۔ کجا کہ اس کو ایک اسلامی ریاست کے لیے دستور بنانے کا مجاز تسلیم کریں۔ تعمیل حکم کے لیے عقلی دلائل مانگنے والے کا مقام اسلام کی سرحد سے باہر ہے نہ کہ اس کے اندر۔"

اس کے آگے اسی مضمون میں مولانا مودودی صاحب نے اسی مسئلہ سے متعلق پیش کیے جانے والے یا پیدا ہونے والے بعض شبہات کے جوابات دیے ہیں اور وہ جوابات بھی بالکل صحیح اور اطمینان بخش ہیں ——— لیکن جس مقصد سے یہاں ہم نے اس مضمون کو نقل کیا ہے اس کے لیے بس یہی حصہ کافی ہے جس میں

مودودی صاحب نے واضح طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلام اور اس کی شریعت میں کسی عورت کے مجلس قانون ساز کا رکن ہونے کی گنجائش نہیں ہے ——— اور یہ کوئی اجتہادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس بارہ میں اللہ و رسول کے واضح احکامات اور ارشادات ہیں اور کسی مسلمان کے مسلمان ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس حکم کو بلا چون و چرا تسلیم کرے۔

اب اس کے آگے سنئے! جیسا کہ ذکر کیا گیا مولانا نے یہ مضمون ۱۹۵۲ء میں لکھا تھا جبکہ پاکستان میں جمہوری حکومت قائم تھی، اس کے ۶-۷ برس بعد وہ وقت آیا کہ پاکستان کے اُس وقت کے فوجی سربراہ جنرل ایوب خاں نے فوجی انقلاب برپا کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی پھر وہ صدر بھی بن گئے ——— اس کے چند برسوں کے بعد انھوں نے چاہا کہ وہ باقاعدہ الکشن کے ذریعہ پاکستان کے "صدر" منتخب ہو جائیں ——— اس مرحلہ پر اُن کے خلاف پاکستان کی اکثر سیاسی پارٹیوں کا ایک "متحدہ محاذ" قائم ہوا، مولانا مودودی کی جماعت اسلامی بھی مولانا موصوف کی رہنمائی میں اس متحدہ محاذ میں شامل تھی بلکہ اُس کی تعمیر و تشکیل میں اس کا حصہ دوسری پارٹیوں سے زیادہ ہی رہا تھا۔ [یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس متحدہ محاذ میں وہ پارٹیاں بھی تھیں جن کی سیاست کا دین سے بلکہ خدا سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ چنانچہ (اُس وقت کے) مشرقی پاکستان کے معروف لیڈر بھاشانی صاحب کی پارٹی بھی تھی جو کھلے کمیونسٹ اور کمیونزم کے پرجوش داعی و علمبردار تھے ——— مودودی صاحب کے "دینی حکمت عملی" کے فلسفہ نے "جماعت اسلامی" کے لیے ان سب کے ساتھ اشتراک عمل اور رفاقت کو صرف جائز ہی نہیں بلکہ "اقامت دین" کے تعلق سے کار ثواب بنا دیا تھا۔]

اس متحدہ محاذ کو صدر ایوب کے مقابلہ میں کسی مضبوط امیدوار کو کھڑا کرنا تھا۔ متحدہ محاذ میں شامل پارٹیاں اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ملک میں صرف مس فاطمہ جناح[1] کی شخصیت ایسی ہے کہ صدر ایوب کے مقابلہ میں ان کی کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے" اور انھوں نے انھی کے بارہ میں فیصلہ کر لیا ـــــــ "جماعت اسلامی" کو اس میں یہ مشکل پیش آئی کہ وہ ابتک یہ کہتی آئی تھی اور اس کے بانی اور رہنما مولانا مودودی قرآن و حدیث کے حوالوں سے لکھ چکے تھے کہ اسلام اور اسلامی شریعت میں کسی عورت کے مجلس قانون ساز کا ایک عام رکن اور ممبر ہونے کی بھی گنجائش نہیں ہے چہ جائے کہ اس کو مملکت کا صدر اور سربراہ بنایا جائے (جو ایک حد تک مختار کل ہوتا ہے) ـــــــ لیکن مودودی صاحب نے "دین میں حکمت عملی" کا جو فلسفہ پیش فرمایا تھا اور اس کے جو دلائل دیے تھے (مثلاً یہ کہ اکراہ کی صورت میں زبان سے کلمۂ کفر کہنا بھی جائز ہے اور حالت اضطرار میں حرام اور مردار کھا لینے کی بھی اجازت ہے وغیرہ وغیرہ) اس کی روشنی میں اس مشکل کا بھی حل نکال لیا گیا ـــــــ "جماعت اسلامی" کی مجلس شوریٰ نے پاکستان کی صدارت کے لیے مس فاطمہ جناح کی امیدواری کے بارہ میں اپنے موقف کا اعلان کرتے ہوئے جو بیان جاری کیا تھا اس میں فرمایا گیا تھا کہ

> شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہو سکتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے، اب یہ واضح ہے کہ عورت کو امیر

---

[1] یہ فاطمہ جناح تحریک پاکستان کے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کی بہن تھیں۔ ۱۲

بنانے کی ممانعت اُن حرمتوں میں سے نہیں ہے جو ابدی اور قطعی ہیں بلکہ دوسری قسم کی حرمتوں ہی میں اس کا شمار ہو سکتا ہے ـــــ اس لیے ہمیں ان حالات کا جائزہ لیکر دیکھنا چاہیے جن میں یہ مسئلہ ہمارے سامنے آیا ہے۔"

(اس کے بعد حالات کی وضاحت کی گئی تھی اور پھر ان الفاظ پر مجلس شوریٰ کی یہ قرارداد ختم ہوتی تھی۔)

"مذکورۂ بالا وضاحت کی روشنی میں اس مجلس نے صدارتی انتخاب کے لیے موجودہ صدر کے مقابلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کی تائید اور حمایت کا فیصلہ کیا ہے اور یہ مجلس عوام سے اپیل کرتی ہے اور جماعت کے کارکنوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ جبر و استبداد سے نجات پانے کے لیے اس آخری موقع سے پورا فائدہ اٹھائیں اور اس مہم کو تن من دھن سے کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔"

پھر ایسا ہی ہوا کہ پاکستان کی جماعت اسلامی کے "الکشنی مجاہدین" نے اس معرکہ کو "جہاد فی سبیل اللہ" قرار دے کر مس فاطمہ جناح کو کامیاب بنانے کے لیے تن من دھن کی بازی لگادی، اور جب انھیں یہ "شرعی" رہنمائی مل گئی تھی کہ یہ ایسا عظیم و اعلیٰ مقصد ہے کہ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اگر ضرورت پڑے تو بقدر ضرورت حرام کا بھی ارتکاب کیا جاسکتا ہے تو ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ الکشن جیتنے کے تقاضے سے کیا کچھ نہ کیا گیا ہوگا ـــــ

پھر یہاں ایک یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مس فاطمہ جناح کا معاملہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ وہ بس ایک "عورت" تھیں ـــــ ہر باخبر اور جماعت اسلامی کا تو ہر فرد جانتا تھا کہ مولانا مودودی کی خاص اصطلاح میں وہ زیادہ سے زیادہ

بس نسلی مسلمان" اور "مردم شماری کے رجسٹر کی مسلمان" ہیں ——— اسلام سے ان کا جیسا عملی تعلق تھا وہ بالکل ظاہر باہر تھا، اور ان کی یہ بات قابل تعریف ہے کہ انھوں نے الکشن کی مصلحت کے تقاضوں سے بھی اپنے کو بدلنے کی ضرورت نہیں سمجھی — بدلے تو "اقامت دین" کے علمبردار بدلے۔ ؎

گلہ اجفائے وفا نما حرم کو جو اہل حرم سے ہے
جو میں بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

یا بدیع العجائب! ایا تو معیار کی یہ بلندی کہ جماعت کے دستور میں، جماعت کے صف اول کے ارکان کے بارے میں کہا گیا تھا۔

"ان کے لیے احکام شرعیہ کی پابندی کے معاملہ میں کوئی رعایت نہ ہوگی، ان کو مسلمانوں کی زندگی کا پورا نمونہ پیش کرنا ہوگا، اور ان کے لیے رخصت کے بجائے عزیمت کا طریقہ ہی قانون ہوگا۔"

یا یہ تسفل اور گراوٹ کہ جان بوجھ کر ایک حرام کا ارتکاب کیا جارہا ہے اور پورے ملک کے مسلمانوں سے اس حرام کے ارتکاب کی اپیل کی جارہی ہے اور اس کے لیے شرعی حرمتوں میں "ابدی" اور "غیر ابدی" "قطعی" اور "غیر قطعی" کی تقسیم کی جارہی ہے۔

راقم سطور کے نزدیک "دین میں حکمت عملی" کے فلسفہ کا یہ عملی مظاہرہ تھا اور کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے کرایا ہو کہ ہر شخص اس فلسفہ کی حقیقت اور اس کی خطرناکی کو بچشم خود دیکھ سکے۔ لیهلك من هلك عن بينة ويحيى من حى عن بينة۔

جس زمانہ میں یہ سب کچھ ہوا اسی زمانہ میں جمادی الاخریٰ ۱۳۸۴ھ (نومبر ۱۹۶۴ء) کے "الفرقان" میں اس سے زیادہ تفصیل سے اس موضوع پر لکھا گیا تھا۔ اور

راقم سطور نے اوپر کی سطروں میں مس فاطمہ جناح کے الکشن سے متعلق جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی قرارداد کا جو متن نقل کیا ہے وہ اسی سے ماخوذ ہے۔

صرف وقتی غلطی نہیں بلکہ فتنہ کا دروازہ

دین میں حکمت عملی کا یہ فلسفہ جس کو مولانا مودودی صاحب نے ۵۸ء میں تحریری طور پر پیش فرمایا تھا (جس کا پچھلے صفحات میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جا چکا ہے) اور ۶۵ء میں مس فاطمہ جناح کے الکشن میں جس کا پورا عملی تجربہ اور مظاہرہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہ صرف ایک وقتی غلطی نہیں تھی جو بس ہو چکی، بلکہ (اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرمائے) اس نے قیامت تک کے لیے دین میں فتنوں کا ایک وسیع دروازہ کھول دیا ہے۔

جو لوگ جماعت اسلامی کے حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ جماعت کا اصل کارفرما عنصر وہ جدید تعلیم یافتہ حضرات ہیں، جنھوں نے دین کا علم بنیادی طور پر صرف مولانا مودودی کی تصنیفات سے حاصل کیا ہے اور ان کی تمام تر ذہنی تربیت مولانا ہی کی تحریروں سے ہوئی ہے[1] ان تحریروں نے اُن کے ذہنوں میں یہ بات

---

[1] اس صورت حال کا اندازہ صرف اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ "جماعت اسلامی پاکستان" کا (جو اصل جماعت اسلامی ہے اور باقی ہندوستان یا کشمیر میں تو بس اُس کی گویا شاخیں ہیں، سب کے بانی اور رہنما مولانا مودودی ہی ہیں) امیر اپنی جگہ خود مولانا مودودی صاحب نے یا ان کی رہنمائی میں "جماعت" نے ہمارے عزیز دوست میاں طفیل محمد صاحب کو (جو غالباً بی اے ایل ایل بی ہیں) اور جنرل سکریٹری پروفیسر غفور احمد کو بنایا ہے۔ راقم سطور دونوں حضرات سے واقف ہے اور دونوں کے بارہ میں نیک گمان اور اچھی رائے رکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے ان حضرات

(باقی اگلے صفحہ پر)

جھٹلا دی ہے کہ امت میں قرن اول کے بعد سے قرآن کی اور دین کی بنیادی اصطلاحوں (الٰہ، رب، عبادت وغیرہ) کا مفہوم اور دعوتِ توحید کا مدعا تک بھی صحیح نہیں سمجھا جا رہا تھا، اب چودھویں صدی میں مولانا مودودی صاحب نے اس کو صحیح سمجھا اور سمجھایا ہے، اور دین کی حقیقت اور روح بھی وہی ہے جو مولانا موصوف نے سمجھی اور بیان فرمائی ہے۔ ورنہ اگلے زمانوں کے تو مجددین (مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید وغیرہ) سے بھی دین کے بارہ میں بڑی بڑی غلطیاں ہوئی ہیں اور وہ حقیقی اسلام اور جاہلیت کے اثرات کے درمیان پورا امتیاز نہیں کر سکے۔

—— یہ طبقہ (جو جماعت اسلامی کا اصل کارفرما عنصر ہے) اس حال میں نہیں ہے کہ براہ راست کتاب و سنت سے اور ائمہ سلف اور امت کے علمائے محققین کی تصنیفات سے رہنمائی حاصل کر سکے، اس کے پاس علم دین کا سارا سرمایہ بس مودودی صاحب کی تصنیفات اور جماعت کا لٹریچر ہے —— پھر اس کو "دین کی حکمت عملی" کے عنوان سے مولانا موصوف نے یہ اصول بھی سکھا دیا ہے اور اس پر عمل کر کے اور کرا کے بھی دکھلا دیا ہے کہ "اقامت دین" کی جد و جہد کے سلسلہ میں (جس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے پاس علم دین کا سرمایہ بس وہی ہے جو انھوں نے مودودی صاحب اور ان جیسے دوسرے حضرات کی کتابوں سے حاصل کیا ہے اور اسی نے ان کی ذہنی تربیت کی ہے —— احتیاط سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی میں ۹۸-۹۹ فی صد ایسے ہی حضرات ہیں جن کے لیے دین کا ماخذ صرف مودودی صاحب اور ان کی تصانیف ہیں، ۱-۲ فیصد ایسے حضرات بھی ہوں گے جو بوقت ضرورت کتاب و سنت اور قدیم اسلامی کتب خانہ کی طرف رجوع کر سکیں۔ ان کے بارہ میں راقم سطور کا یہ حسن ظن ہے کہ وہ غالباً اسی حال میں ہوں گے جس حال میں خود یہ عاجز طویل مدت تک رہا۔

استدراک سطور بالا کی کتابت ہو چکی تھی۔ ایک صاحب نے بتلایا کہ پروفیسر غفور احمد صاحب "جماعت اسلامی پاکستان" کے نمائندے کی حیثیت سے "قومی اتحاد" کے جنرل سکریٹری تھے۔ جماعت کے جنرل سکریٹری دوسرے صاحب ہیں، وہ بھی جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی کے ایک فرد ہیں۔

عملی صورت اب انکشنی معرکے ہی ہیں) اگر ضرورت پڑے تو "بقدر ضرورت" کسی ناجائز اور حرام کام کا بھی ارتکاب کیا جاسکتا ہے ـــــ تو سوچا جاسکتا ہے کہ الکشن کے میدان میں کام کرنے والے جماعت اسلامی کے "مجاہدین" میدان جیتنے کے لیے اس "فتوے" کی روشنی میں کیا کچھ نہ کریں گے۔

پاکستان میں (اور اسی طرح ہندوستان میں بھی) کوئی ذی شعور نہ ہوگا جو اس حقیقت سے واقف نہ ہو کہ الکشنوں میں خاص کر نیچے کی سطح پر کیا ہوتا ہے اور جیتنے کے لیے کیا کیا کرنا ناگزیر سمجھا جاتا ہے، اور وہ کر کیا کیا کرتے ہیں ـــــ پارٹی کے پروپیگنڈے میں جھوٹ بولنا اور پوری بیباکی سے جھوٹ بولنا، جان بوجھ کر عوام کو غلط امیدیں دلانا، حریف پارٹی یا حریف امیدوار کے واقعی یا غیر واقعی عیوب کی تشہیر کرنا اور اس سلسلہ میں بہتان بازی اور افترا پردازی سے بھی دریغ نہ کرنا، ووٹروں کو طرح طرح کے لالچ اور گنجائش ہو تو رشوت بھی دینا، جعلی ووٹ ڈلوانا، وغیرہ وغیرہ، کون سی بے ایمانی اور بددیانتی ہے جو الکشن کے میدان میں نہ ہوتی ہو اور ضروری نہ سمجھی جاتی ہو۔

جب جماعت اسلامی کے الکشنی مجاہدین کے سامنے مولانا مودودی صاحب کا قرآن و حدیث کے دلائل سے مزین یہ فتویٰ موجود ہو کہ ـــــ "اقامت دین" کی جدوجہد کے سلسلہ میں اگر ضرورت پڑے تو "بقدر ضرورت" کسی ناجائز اور حرام کام کا بھی ارتکاب کیا جاسکتا ہے ـــــ تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ "مجاہدین" الکشن کی بازی جیتنے کے لیے وہ سب کچھ نہ کریں جس کی ضرورت سمجھیں اور جو آخرت کی فکر نہ رکھنے والے اور جائز و ناجائز اور عذاب و ثواب سے بے فکر ناخدا ترس الکشن باز عام طور سے کرتے ہیں، فرق صرف اتنا ہوگا کہ دوسرے لوگ ناجائز و حرام سمجھ کر کریں گے اور جماعت اسلامی کے "مجاہدین" یہ سب کچھ جائز بلکہ کار

ثواب اور جہاد فی سبیل اللہ سمجھ کر کریں گے

اور پھر بات الکشن کے میدان ہی تک محدود نہیں رہتی ——— مولانا نے تو اپنے فدائی اس طبقہ کے ہاتھ میں ——— جس نے کالجوں سے نکلنے کے بعد دین صرف انکی کتابوں سے اور جماعتی اخبارات و رسائل ہی سے سیکھا ہے اور وہ صرف انہی کو دین کا رازداں اور قابل اعتماد ترجمان یقین کرتا ہے ——— یہ خطرناک اصول دیدیا ہے کہ "اقامت دین" کے مقصد کی خاطر حکومتی اقتدار حاصل کرنے کے لیے کسی بھی ایسے کام کے کرنے کی ضرورت پڑے جس کی قرآن و حدیث میں ممانعت فرمائی گئی ہو تو بقدر ضرورت وہ کام کیا جا سکتا ہے ——— یہ عاجز بار بار غور کرنے کے بعد بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس اصول کے تحت "اقامت" دین کے مقصد ہی کی خاطر کسی سیاسی حریف کو راستہ سے ہٹانے کے لیے اگر اس کو ختم کرا دینے کی یا اس پر کوئی جھوٹا کیس چلوا کر جیل بھجوا دینے کی ضرورت محسوس کی جائے تو مولانا کے متبعین کو اس کے جائز بلکہ کار ثواب ہونے میں کیوں کوئی شک اور تذبذب ہوگا ——— غور فرمایا جائے، مولانا کا یہ نظریہ تو وقت کے ہر "یزید" اور "حجاج" کے لیے سند اور دستاویز بن سکتا ہے ——— نیتوں کا حال تو اللہ ہی کے علم میں ہوتا ہے۔

اس عاجز کا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ دین میں فتنہ کا اتنا بڑا دروازہ مولانا نے جان بوجھ کر کھولا ہے، میرا گمان یہی ہے کہ جس طرح دین کی بنیادی اصطلاحوں سے متعلق اپنے دعوے کے دور رس نتائج اور خطرناکی کا میرے خیال کے مطابق ان کو شعور نہیں ہوا اسی طرح "دین میں حکمت عملی" کے اس نظریے کے ان عواقب کی طرف بھی غالباً ان کی نظر نہیں گئی واللہ اعلم ——— اگر میرا یہ گمان صحیح ہے تو اپنے قدیم تعلق کی بنا پر میں ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ وہ میری ان گزارشات کو سامنے رکھ کر ان دونوں مسئلوں پر غور فرمائیں اور رجوع فرما کر فتنہ کے اس وسیع دروازہ کو خود ہی بند کر دیں جو ان دونوں مسئلوں سے متعلق ان کی تحریروں سے کھل گیا ہے ——— "ویتوب اللہ علی من تاب۔"

تیسری (۳) ایسی ہی افسوسناک غلطی (غلاف کعبہ کی گشتی نمائش)

انبیائی طریقہ پر جدوجہد کا دعویٰ ——— اور یہ طرز عمل

جب یہ طے کر لیا گیا کہ پاکستان میں "اقامت دین" کی منزل تک پہنچنے کا راستہ یہی ہے کہ الکشن کے ذریعہ کسی طرح بھی اقتدار حاصل کیا جائے ———
اور اس جدوجہد میں کامیابی کے لیے جائز، ناجائز جو بھی کرنا ضروری سمجھا جائے وہ سب کچھ کیا جائے تو "غلاف کعبہ کی گشتی نمائش" کا ایک انتہائی افسوسناک اور عبرتناک کارنامہ بہ نفس نفیس خود مولانا مودودی صاحب نے ایسا انجام دیا کہ جو لوگ "ترجمان القرآن" کے ابتدائی دور سے قریباً ۲۰ سال تک اس میں ان کی تحریریں پڑھتے رہے تھے وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مولانا ایسے بھی کسی کام میں اپنے کو ملوث کرنے پر آمادہ کر سکیں گے ———

اپنی تحریروں میں مولانا موصوف "وہابیت" میں اتنے بے لچک اور اتنے آگے بڑھے ہوئے تھے کہ ان کے ہاں سلسلہ سلوک و تصوف کے ان اوراد و اشغال کی بھی گنجائش نہ تھی جو حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید اور ان کے منتسبین و متبعین جماعت دیوبند اور جماعت اہلحدیث کے مشائخ و اکابر کے معمولات میں رہے تھے ——— اس لیے مولانا مودودی صاحب کی "وہابیت" خود ان کی اور ان کے معتقدین کی نظر میں بڑی خالص و بے آمیز تھی، اور وہ یقیناً ان کی مابہ الفخر متاع تھی، لیکن الکشن کی راہ میں انہوں نے اپنی اس متاع عزیز کو بھی قربان کر دیا۔

۱۹۶۳ء (۱۳۸۳ھ) میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے، کہ سعودی حکومت نے (جس کے فرمانروا اُس وقت شاہ سعود بن عبد العزیز تھے) کعبۃ اللہ کا غلاف اپنے طور پر اور اپنے اہتمام سے تیار کرانے کا فیصلہ کیا (اس سے پہلے غلافِ کعبہ ہر سال مصر سے آنے کا معمول رہا تھا)، سعودی حکومت نے غلاف (یا اس کا کچھ حصہ[1]) پاکستان میں بنوانے کا فیصلہ کیا اور مولانا مودودی اس کے ذمہ دار ٹھیرائے گئے ——— یہ صدر ایوب خاں کی حکومت کا زمانہ تھا اور الکشن کی بات چیت اور ابتدائی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں ——— مولانا مودودی اور اُن کے رفقا پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت کی دین سے جہالت اور اس خرافی ذہنیت سے خوب واقف تھے کہ اگر اعلان کرایا جائے کہ بغداد شریف کے بڑے پیر صاحب کے جبے شریف کی فلاں تاریخ کو فلاں جگہ زیارت کرائی جائے گی تو یہ مخلوق بے تحاشا ٹوٹ پڑے گی ——— اس کے باوجود انھوں نے - غلاف کعبہ شریف کے ذریعہ جماعت کے پروپیگنڈے اور اس سے الکشنی فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بنایا ——— پہلے غلاف شریف کے تیار کرانے کا اپنے اخبارات وغیرہ کے ذریعہ خوب پروپیگنڈہ کرایا، اس کے افتتاح کی بڑے پیمانے پر ایک تقریب منائی گئی ——— پھر جب وہ تیار ہو گیا تو پروگرام بنایا کہ پاکستان کی مختلف ریلوے لائنوں پر غلاف شریف کی گشتی نمائش کے لیے اسپشل ٹرینیں چلائی جائیں اور اُن کے اوقات اور پروگرام کی پہلے سے خوب تشہیر کی جائے اور عوام کو دعوت دی جائے کہ

---

[1] اسی زمانہ میں سنا تھا کہ سعودی حکومت ہی نے غلاف کعبہ کا کچھ حصہ بنارس میں بھی تیار کرایا ہے۔ لیکن میں نے کبھی اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی اس لیے میرے علم میں نہیں کہ واقعہ کیا تھا - ۱۲

وہ اسٹیشنوں پر آکر مولانا مودودی اور ان کی جماعت اسلامی کے تیار کرائے ہوئے غلاف کعبہ شریف کی زیارت کریں۔

چنانچہ اس منصوبہ پر اسی طرح عمل ہوا، لاکھوں کے خرچ سے اسپیشل ٹرینیں چلیں، معلوم ہوا تھا کہ اس عظیم کارنامہ کے اصل ذمہ دار اور جماعت کے امیر کی حیثیت سے ان ٹرینوں میں سے ایک ٹرین پر بہ نفس نفیس خود مولانا مودودی صاحب نے بھی سفر فرمایا تھا، جماعت کے اخبارات میں ان ٹرینوں کے سفر کی رپورٹ کے ساتھ زائرین کے پرشوق جذبات کی تصویر کشی عجیب و غریب انداز میں کی جاتی تھی، اور اس سلسلہ میں اس بات کو چھپانے کی بھی کوشش غالباً ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی کہ یہ سب جماعت کے پروپیگنڈے کے لیے اور الکشن کے لیے زمین ہموار کرنے کے واسطے ہو رہا ہے۔

جماعت کے اخبارات میں اس گشتی نمائش کے سلسلہ میں اُس زمانہ میں جو کچھ اور جس طرح لکھا جا رہا تھا اُس کی کچھ جھلکیاں یہاں بھی ناظرین کرام دیکھ لیں۔

جماعت کے ترجمان "ایشیا لاہور" کے اداریہ میں لکھا گیا تھا ——

"آج کل مغربی پاکستان کے ریلوے اسٹیشنوں پر دو اسپیشل ٹرینیں غلاف کعبہ کی زیارت کرا رہی ہیں، ایک ٹرین لاہور سے پشاور کی طرف منزل بہ منزل رواں دواں ہے، دوسری خاص ٹرین اوکاڑہ منٹگمری کی جانب تشنگانِ دیدارِ غلاف کو سیراب کر رہی ہے، ہر اسٹیشن پر عوام کے ذوق شوق اور عقیدت و محبت کا عجیب عالم ہے، چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر لاکھوں کا ہجوم ہوتا ہے، مرد عورتیں، بچے بوڑھے جسے دیکھیے بس ایک نظر دیکھ لینے کی سعادت حاصل کر لینے کو بے تاب ہیں .... خواتین غلاف کعبہ پر

پھول اور پیسے کچھاور کرتی ہیں، بڑے بڑے افسر اور معززین عقیدت سے اس کے حضور دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ چونکہ غلاف کعبہ کو چھولے چومنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے بعض مقامات پر لوگوں نے فرط عقیدت میں ٹرین ہی کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔

" ایشیا لاہور " ۲۰ مارچ ۱۹۶۳ء

انہی دنوں میں " جماعت اسلامی پاکستان " کے ایک دوسرے اخبار " شہاب " کا خاص " غلاف کعبہ نمبر " نکلا تھا ـــــ اس کی طویل رپورٹ کی بھی چند سطریں پڑھ لیجیے۔

۱۷ مارچ کو سوا نو بجے غلاف کعبۃ اللہ زاداللہ عظمۃ اور اس کے ناچیز خدام کو لیکر غلاف کعبہ اسپشل ٹرین " زائرین کے نعرہ ہائے تکبیر کے درمیان روانہ ہوئی راہ میں سادھو کے مرید وغیرہ جن اسٹیشنوں پر گاڑی کو رکنا نہیں تھا لیکن ہزاروں آنکھیں متحیر و متجسس گاڑی کو تک رہی تھیں۔ لائن مرمت کی وجہ سے چند منٹ کے لیے اِن پیاسی نگاہوں کی تسکین کا انتظام اللہ نے کر دیا۔ کاموں کے گاڑی کے دونوں طرف عورتوں اور مرد زائرین کا جم غفیر منتظر تھا۔ اسی طرح گجرانوالہ، وزیر آباد، سیالکوٹ میں علی الترتیب محتاط اندازے سے تقریباً دس لاکھ افراد زیارت سے مشرف ہوئے۔ لوگ دور دراز فاصلوں، دیہات سے سفر کر کے آئے اور عقیدت بھرے دل، محبت سے پرنم آنکھیں اور رخسار ملتے ہوئے زائرین میں سے حرکت کر کے اپنا راستہ نکالنا مشکل ہو جاتا تھا . . . . . عورتیں اپنے دوپٹے، تسبیحیں، مرد رومال، ٹوپیاں پگڑیاں غلاف مقدس کے ساتھ مس کرنے چومنے کے لیے بیتاب تھے۔ پھولوں کے ہار، گلدستے، عطر کی شیشیاں غلاف کے لیے

لاتے رہے۔"

"شہاب لاہور" غلاف کعبہ نمبر (۱۹۵۳ء)

واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ "جماعت اسلامی" کے اخبارات کے بجائے دوسرے اخبارات میں شائع ہوا ہوتا تو ہم جیسے لوگ یہ سمجھتے کہ یہ مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی" کے مخالفین نے اُن پر تہمت لگائی ہے اور مذاق بنایا ہے۔ کہاں مولانا اور کہاں یہ خرافاتی تماشے! ـــــ ہم لوگ یہ سب کچھ "جماعت اسلامی پاکستان" کے ان موقر اخبارات میں دیکھتے پڑھتے تھے اور زبان حال یا زبان قال سے کہتے تھے۔

ع ایں کہ مے بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

اسی زمانہ میں مولوی عتیق الرحمٰن نے الفرقان کے ایک اداریہ میں یہ سارے اقتباسات "ایشیا" اور "شہاب" سے نقل کیے تھے ـــــ اس اداریہ کا عنوان تھا ـــــ "دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"

مجھے اچھی طرح یاد ہے، میرے بچپن میں ہمارے محلہ کے خوشحال گھرانوں میں جن میں ایک ہمارا گھر بھی تھا کبھی کبھی ایک بڑی بی آیا کرتی تھیں، سر سے پاؤں تک سفید پوش، برقعہ بھی سفید، ان کے ساتھ ایک اور عورت ہوتی تھی اس کے سر پر ایک صندوقچہ ہوتا تھا۔ صندوقچہ میں ایک سفید پتھر ہوتا تھا قریباً ایک فٹ مربع، اس میں ایک انسانی قدم کا نشان ہوتا تھا قریباً پون انچ گہرا جس کے متعلق بڑی بی بتلاتی تھیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کا نشان ہے۔ اس پتھر پر آپ نے قدم مبارک رکھا تھا تو یہ نشان پڑ گیا تھا، یہ حضور کا معجزہ تھا۔ ـــــ اس سفید پتھر کے علاوہ صندوقچہ میں ایک سیاہ رنگ کا کپڑے کا ٹکڑا بھی ہوتا تھا جس کے بارہ میں وہ بتلاتی تھیں کہ یہ کعبہ شریف کے غلاف کا ٹکڑا ہے

اُس زمانہ کی ہمارے گھروں کی سیدھی سادی بوڑھی عورتیں غالباً ان سب باتوں کا یقین کرلیتیں، غلاف شریف کو اور قدم شریف کو چومتیں اور آنکھوں سے لگاتیں اور حسب توفیق اُن بڑی بی کی خدمت میں نذرانہ پیش کرتیں ـــ مجھے معلوم نہیں کہ وہ بڑی بی ہمارے قصبہ سنبھل ہی کی تھیں یا کہیں باہر سے تشریف لاتی تھیں۔ "غلاف کعبہ کی گشتی نمائش" نے قریباً ستر سال پہلے کے اس واقعہ کو یاد دلادیا جس کو راقم سطور بالکل بھولے ہوئے تھا۔[1]

اس سلسلہ میں بہت ہی افسوس اور رنج وقلق اس سے ہوا کہ "جماعت اسلامی پاکستان" کے کسی ایک صاحب کے بارہ میں بھی علم میں نہیں آیا کہ انھوں نے اس "دینی تماشے" کے خلاف آواز اس وقت بلند کی ہو اور اس پر نکیر کی ہو۔ حالانکہ اس کی قباحت وشناعت اور دین وشریعت کی روح کے لیے اس کی مضرت کے ادراک کے واسطے کسی خاص درجہ کے علم کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ہر سلیم فطرت خود ہی اس کا ادراک کرسکتی تھی۔

ہاں ہمارے ہاں "جماعت اسلامی ہند" کے حلقہ میں ایک "رجل رشید" نکلے یہ بمبئی کے شمس پیرزادہ صاحب تھے، یہ صاحب علم ہیں اور مسلکاً اہل حدیث ہیں۔ راقم الحروف جب سے ان سے واقف ہے ان کے اخلاص اور تصلب فی الدین کا قائل ہے۔ انھوں نے "غلاف کعبہ کی اس گشتی نمائش" کے خلاف کھل کر لکھا اور "انکار منکر" کا حق ادا کیا، اگرچہ انھوں نے اپنے مضمون میں اس کی کوشش فرمائی کہ ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ اس کی اصل ذمہ داری مولانا مودودی صاحب پر ہے،

---

[1] راقم سطور نے یہاں یہ واقعہ تضحیک کے لیے نہیں لکھا بلکہ کافی فکر و تردد کے بعد اس لیے لکھ دینا مناسب سمجھا کہ اس کی روشنی میں "غلاف کعبہ کی گشتی نمائش" کی نوعیت کو سمجھنے اور اس سے عبرت حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

لیکن بہرحال حکم شریعت کے اظہار میں انھوں نے کسی مداہنت سے کام نہیں لیا، انھوں نے اپنے مضمون میں اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی تھی کہ جو کپڑا ابھی خانہ کعبہ کے قریب بھی نہیں گیا (لاہور میں بنا گیا ہے اور مکہ معظمہ سے قریباً ڈھائی ہزار میل کے فاصلہ پر ہے) اس کو کعبہ شریف کا غلاف ہونے کی عظمت کیسے حاصل ہو گئی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے "فتح الباری" (شرح صحیح بخاری) کے حوالہ سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ایک واضح ارشاد اور فتویٰ بھی دلیل کے طور پر نقل کیا تھا ——— ان کا یہ مضمون "جماعت اسلامی ہند" کے ترجمان "دعوت دہلی" ۲۵ر اپریل ۶۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا ——— اور اسی کے حوالہ سے ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ کے الفرقان کے شمارہ میں نقل ہوا تھا ——— اس وقت وہی راقم سطور کے سامنے ہے ———

شمس پیرزادہ صاحب نے مسئلہ پر ایک حد تک اصولی گفتگو کرنے کے بعد مضمون کو ان سطروں پر ختم کیا تھا۔

"اگر غلاف کعبہ کے سلسلہ میں جلوس وغیرہ کی ہمت افزائی کی گئی تو یہ بات بجائے خود بدعت ہوگی، نیز دوسری بہت سی بدعتوں بلکہ شرک کے لیے راہ کھل جائے گی اور اندیشہ ہے کہ غلاف ایک نیا تعزیہ نہ ثابت ہو جائے ان وجوہ سے میں مولانا مودودی صاحب کی نیت پر شبہ کیے بغیر یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا اجتہاد سراسر غلط ہے اور بہتر یہ ہے کہ مولانا اس سے رجوع کر لیں"

(الفرقان بابت ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ بحوالہ دعوت دہلی ۲۵ اپریل ۶۳ء)

راقم سطور کے علم میں نہیں ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے اپنے ایک مخلص معتقد اور اپنی جماعت اسلامی ہند کے ایک ممتاز رکن شمس پیرزادہ صاحب کی اس درخواست

اور اپیل کو منظور فرما کر اپنی اس عظیم غلطی سے رجوع فرمایا یا نہیں ـــــ اگر رجوع نہیں فرمایا ہے تو یہ عاجز بھی اپنے قدیم تعلق کی بنا پر درخواست کرتا ہے کہ وہ اس سے رجوع فرمالیں اور اس کا اعلان فرمادیں ۔ ورنہ یہ خطرہ ہے کہ کل جب وہ دنیا میں نہ رہیں تو اُن کے متبعین اس کو سند بنا کر اقامت دین کی جد و جہد کو تقویت پہنچانے کے نام پر آئندہ بھی ایسے ہی یا اس سے بھی زیادہ قبیح و شنیع تماشے کریں ـــــ

(۴) ایک انتہائی خطرناک اور فتنہ انگیز دعویٰ

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی دعوت کو قبول نہ کرنے والے مسلمانوں کی پوزیشن وہی ہے جو قوم یہود کی تھی

ابھی کچھ عرصہ پہلے ایک صاحب نے مولانا مودودی صاحب کے ایک بیان کی طرف توجہ دلائی جو جماعت اسلامی کی روداد حصہ دوم میں شائع ہوا تھا اس بیان کا متن یہ ہے۔

"اس موقع پر میں ایک بات نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس قسم کی ایک دعوت کا جیسی کہ ہماری یہ دعوت ہے کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے، جب تک حق کے بعض منتشر اجزاء باطل کی آمیزش کے ساتھ سامنے آتے رہیں، ایک مسلمان قوم کے لیے ان کو قبول نہ کرنے اور اُن کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول سبب موجود رہتا ہے اور اُس کا عذر مقبول ہوتا رہتا ہے۔ مگر جب پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا جائے اور

اُس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے تو اُس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اُس خدمت کو انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہو جو امت مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے، یا نہیں تو اسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کرے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے، ایسی صورت میں ان دو راہوں کے سوا کسی تیسری راہ کی گنجائش اس قوم کے لیے باقی نہیں رہتی۔"

اسی سلسلۂ بیان میں مودودی صاحب آگے فرماتے ہیں:۔

"اب چونکہ یہ دعوت ہندوستان میں اُٹھ چکی ہے اس لیے کم از کم ہندی مسلمانوں کے لیے تو آزمائش کا وہ خوفناک لمحہ آ ہی گیا ہے۔ رہے دوسرے ممالک کے مسلمان تو ہم ان تک اپنی دعوت پہنچانے کی تیاری کر رہے ہیں، اگر ہمیں اس کوشش میں کامیابی ہو گئی تو جہاں جہاں یہ پہنچے گی وہاں کے مسلمان بھی اسی آزمائش میں پڑ جائیں گے"۔

(روداد جماعت اسلامی حصہ دوم ۱۷-۱۸)

مودودی صاحب کا یہ بیان ۱۹۴۴ء کا ہے۔ راقم سطور کو کبھی پہلے اس کا دیکھنا یا سننا یاد نہیں، جیسا کہ اوپر عرض کیا ابھی حال میں ایک صاحب کے توجہ دلانے پر اس کو دیکھا ہے۔ میرے علم میں نہیں تھا کہ مودودی صاحب نے کبھی یہ بات بھی کہی ہے کہ امت مسلمہ میں سے جن لوگوں کو ان کی دعوت پہنچ گئی ہے یا آئندہ پہنچے اور وہ اس کو قبول نہ کریں تو ان کی پوزیشن اور ان کا مقام وہ ہو گا جو قوم یہود نے اختیار کیا تھا۔

آتش مزاج اور مغلوب الغضب قسم کے لوگ جب کسی کے خلاف سخت

کلمات (بطور گالی کے) استعمال کرتے ہیں تو اُن کی مراد اُن کے لغوی معنی نہیں ہوتے بلکہ ان کا مطلب صرف غیظ و غضب کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے اس بیان کی یہ نوعیت نہیں ہے اور جہاں تک میں جانتا ہوں وہ فطری طور پر آتش مزاج اور مغلوب الغضب نہیں ہیں، اسی طرح وہ کوئی "مغلوب الحال" قسم کے آدمی بھی نہیں کہ اُن کی اس بات کو "غلبۂ حال" کا نتیجہ کہا جا سکے، بلکہ بیان کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ انھوں نے پوری سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ جماعت اسلامی کے امیر و قائد کی حیثیت سے عام و خاص مسلمانوں کو یہ آگاہی دی ہے کہ اگر وہ اُن کی دعوت کو قبول نہ کریں گے تو پھر ان کی پوزیشن وہی ہوگی جو قوم یہود نے اختیار کی تھی ——

جس شخص کو دین و شریعت کا کچھ بھی علم ہے اس کو اس میں شبہ نہ ہوگا کہ یہ حیثیت صرف اللہ کے نبی و رسول کی ہوتی ہے کہ ان کی دعوت کو رد کرنے اور قبول نہ کرنے والوں کی پوزیشن وہ ہو جائے جو یہود کی تھی، جنھوں نے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو رد کیا تھا اور اس کے بعد اللہ کے آخری نبی و رسول سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو رد کیا،

نبی و رسول کے علاوہ امت کے کسی مصلح، کسی داعی اور کسی مجدد کی بھی یہ حیثیت نہیں ہوتی، کہ ان کی دعوت کو قبول نہ کرنے والوں کے متعلق کہا جا سکے کہ انھوں نے وہ پوزیشن اختیار کرلی ہے جو یہود نے اختیار کی تھی ——
جہاں تک معلوم ہے اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کسی مصلح اور کسی مجدد نے اپنی دعوت کے بارہ میں ایسی بات نہیں کہی[1] —— مودودی صاحب نے غالباً اسی لیے

---

[1] راقم سطور کو یاد ہے کہ جماعت اسلامی کے بالکل ابتدائی دور میں جب مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے مولانا مودودی کے دینی طرز فکر اور اس پر مبنی

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس بیان میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اُن کی دعوت کے علاوہ مسلمانوں کو جو دینی دعوتیں دی جاتی رہی ہیں اور امت میں اصلاح و تجدید کی جو کوششیں ہوتی رہی ہیں یا اب ہو رہی ہیں ان میں حق کے منتشر اجزاء کے ساتھ باطل کی بھی آمیزش رہی ہے[۱] لیکن اُن کی اور ان کی جماعت اسلامی کی دعوت میں پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا گیا ہے ——— اس لیے امت مسلمہ کے خواص و عوام میں سے جن کو بھی یہ دعوت پہنچ جائے اور وہ اس کو قبول نہ کریں تو ان کی پوزیشن وہ ہوگی جو یہود نے اختیار کی تھی۔

مودودی صاحب کے اس بیان کی بنا پر میں یہ الزام اُن پر عائد نہیں کرتا کہ انھوں نے اپنے لیے وہ مقام و منصب ثابت کیا ہے جو نبی و رسول ہی کا ہوتا ہے لیکن اس میں تو کسی شک شبہ اور بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ اس بیان میں انھوں نے واضح الفاظ میں اپنے اس نقطۂ نظر کا اعلان کیا ہے کہ امت مسلمہ ہندیہ کے عوام و خواص میں سے جن کو اُن کی دعوت پہنچ چکی اور انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

دعوت سے شدت کے ساتھ اختلاف ظاہر کیا تھا تو مولانا گیلانی نے اپنے کسی مضمون یا مکتوب میں لکھا تھا کہ مودودی صاحب جس طریقہ پر اور جس انداز میں دعوت دے رہے ہیں یہ امت کے مصلحین و مجددین کا طریقہ نہیں ہے، یہ طریقہ اللہ کے نبیوں کی دعوت کا ہوتا ہے، مودودی صاحب نبیوں کی نقل کرنا چاہتے ہیں ——— مولانا مودودی صاحب کا ۱۹۴۱ء کا یہ بیان اس کی کھلی مثال اور غیر مشتبہ شہادت ہے۔

[۱] امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے اصلاحی و تجدیدی کام کے بارہ میں مودودی صاحب نے صراحت کے ساتھ اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اِن میں خالص حق نہیں تھا، غیر حق کی بھی آمیزش تھی (ملاحظہ ہو رسالہ تجدید و احیاء دین)

رد کر دیا، اور اسی طرح آئندہ جن کو یہ دعوت ہندوستان میں یا کسی دوسرے ملک میں پہنچے اور وہ قبول نہ کریں تو ان کی حیثیت اور پوزیشن وہی ہے اور ہو گی جو یہود کی تھی۔

اور یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ خود مولانا مودودی صاحب کے رسالہ "ترجمان القرآن" اور اُن کی تصانیف اور مختلف زبانوں میں اُن کے ترجموں اور ان کی جماعت کے نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے وسیع وسائل کے ذریعہ جن لاکھوں یا کروڑوں افراد کو، خاصکر کتاب و سنت کا علم رکھنے والے جن اکابر علما کو اُن کی دعوت پہنچ چکی ہے اُن میں سے کم از کم ۹۵ فیصد حضرات نے اس کو قبول نہیں کیا ہے ——— مودودی صاحب کے اس بیان کے مطابق ان سب نے وہ پوزیشن اختیار کرلی ہے جو یہود نے اختیار کی تھی۔ اور ان کا مقام وہ ہے جو قوم یہود کا تھا ——— کس قدر خطرناک اور کتنی فتنہ انگیز ہے یہ بات!!

میں اس بات سے ناواقف نہیں ہوں کہ مودودی صاحب نے اپنی تحریروں اور بیانات میں بار بار اس کا اظہار فرمایا ہے کہ ہماری دعوت، نظام جماعت سے وابستگی کی نہیں ہے بلکہ اس عقیدہ سے اور اُس نصب العین کی طرف ہے جس کو ہم نے پیش کیا ہے ——— لیکن مولانا موصوف کو اور ان کی جماعت کے ہر پڑھے لکھے اور باخبر کو غالباً معلوم ہو گا ——— کہ کتاب و سنت کا علم رکھنے والے ہندوستان و پاکستان کے علما کی غالب اکثریت نے عقیدۂ توحید و رسالت کی اُس تشریح ہی کو قبول نہیں کیا ہے جو جماعت کے دستور میں کی گئی تھی اور جس پر دعوت کی بنیاد ہے۔ بلکہ مولانا مودودی کے اُس فکر ہی سے اختلاف کیا جس پر اس تشریح کی اور اُن کے پیش کیے ہوئے نصب العین کی بنیاد ہے۔

جو حضرات "جماعت اسلامی" کے ابتدائی دور کے حالات سے کچھ واقف ہیں اُن کے علم میں یہ بات ہوگی کہ "جماعت" کے بالکل آغاز ہی میں جن حضرات نے سب سے پہلے صراحت بلکہ شدت کے ساتھ اختلاف کا اظہار کیا وہ یہ تینؐ حضرات تھے ـــــ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی ـــــ مولانا عبدالماجد دریا بادی ـــــ مولانا سید مناظر احسن گیلانی ـــــ یہ تینوں حضرات "ترجمان القرآن" کے ابتدائی دور کے مضامین کی وجہ سے مولانا مودودی کے خاص قدردانوں میں تھے اور اُن کے بارہ میں بہت اچھی رائے ظاہر کرتے رہے۔ خاصکر مولانا دریا بادی تو بہت ہی گرویدہ تھے، اس عاجز کی طرح وہ بھی مودودی صاحب کو "متکلم اسلام" لکھتے تھے، اُس دور میں اُن کے ہفتہ وار "صدق" کے کم ہی پرچے ایسے ہوتے ہوں گے جن میں مولانا مودودی اور اُن کے "ترجمان القرآن" کا تحسین و آفرین کے ساتھ تذکرہ نہ ہوتا ہو ـــــ بہرحال ترجمان القرآن برابر ان تینوں حضرات کے مطالعہ سے گزرتا تھا ـــــ ان حضرات نے "دعوت" پہنچ جاتے اور اُس سے واقف ہو جانے کے بعد ہی اختلاف کیا اور دین کے بارہ میں مودودی صاحب کے اس طرز فکر ہی سے اختلاف کیا جس پر دعوت کی بنیاد تھی ـــــ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے ماہنامہ "معارف اعظم گڑھ" میں اپنے خاص انداز میں تنقید کی۔ مولانا دریا بادی اپنے ہفتہ وار "صدق" میں اُسی زمانہ میں برابر اس موضوع پر لکھتے رہتے، کچھ عرصہ تک "صدق" کے قریباً ہر شمارہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا، اور اپنے خاص انداز میں ہوتا تھا جس کو مولانا مودودی نے اسی زمانہ میں "گوریلا وار" سے تعبیر کیا تھا ـــــ مولانا گیلانی نے اپنے ایک طویل مکتوب میں اپنے اختلاف کا اظہار کیا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ یہ مکتوب "ترجمان القرآن" ہی میں مولانا گیلانی کے نام کے اظہار کے بغیر شائع ہوا تھا، اس کے علاوہ مولانا گیلانی اس سلسلہ میں

مولانا دریابادی کو بھی اس زمانہ میں خطوط لکھتے تھے اور ان کے اقتباسات "صدق" میں شائع ہوتے تھے ـــــ جماعت اسلامی کی تاسیس کے سال ۱۳۶۰ھ ہجری (۱۹۴۱ء-۱۹۴۲ء) کے ترجمان القرآن کے شماروں کے مطالعہ سے بھی ان حضرات کے اختلاف کی نوعیت اور اس کی شدت کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

بہرحال جہاں تک راقم سطور کے علم میں ہے اکابر اہل علم میں سب سے پہلے ان تین حضرات نے اپنے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔ ان تینوں میں یہ بات مشترک تھی کہ یہ "دنیا ومافیہا" سے ناواقف قسم کے نرے "مولانا" نہیں تھے بلکہ عملی دنیا کے حالات ورجحانات، افکار ونظریات اور جدید تحریکوں سے پوری طرح واقف تھے۔ ـــــ اس عاجز کا خیال ہے کہ ان حضرات نے اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے مولانا مودودی کے طرز فکر اور ان کی دعوت میں شروع ہی میں وہ خطرہ محسوس کر لیا جو ہندوستان کے دوسرے اکابر علماء نے جو جدید چیزوں سے ان حضرات کی طرح واقف نہ تھے محسوس نہیں کیا تھا۔

اس کے بعد مختلف اوقات میں اس برصغیر کے بہت سے ان اکابر علماء نے جو علم کتاب وسنت کے وارث وامین تھے مودودی صاحب سے اختلاف کا اظہار کیا اور اُن کی دعوت کو شدت کے ساتھ رد کر دیا ـــــ یہاں مثال کے طور پر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ کے نام لیے جا سکتے ہیں ـــــ بعض اکابر علماء اہلحدیث نے بھی اسی طرح شدت سے اپنے اختلاف کا اظہار فرمایا۔

بعض دوسرے اکابر علماء ہیں جنھوں نے اگرچہ مولانا مودودی اور ان کی جماعت کی دعوت سے اپنے اختلاف کا اظہار اس طرح شدت کے ساتھ نہیں کیا

لیکن ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ اس عاجز کی معلومات کے مطابق اس کی مثال میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ[1] اور اُن کے حلقہ کے اکثر اکابر علما، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری، نیز حضرت مولانا شمس الحق افغانی، حضرت مولانا عزیر گل سرحدی، حضرت مولانا عبد الحق (اکوڑہ خٹک) وغیرہ حضرات کا نام لیا جاسکتا ہے۔

[1] یہاں حضرت تھانویؒ سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس کا تعلق راقم الحروف ہی سے ہے، اور اس سے پہلے وہ کبھی تحریر میں نہیں آیا ہے ــــــ

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے ساتھ اس عاجز کا جیسا تعلق تھا اور جس طرح میں اسکی دعوت کا علمبردار تھا اُس کا ذکر سرگزشت کے ضمن میں آچکا ہے ــــــ جماعت کی تاسیس کے چند ہی روز کے بعد میں نے "تاسیسی اجتماع کی روئداد" اور "دستور" کی ایک ایک کاپی حضرت تھانویؒ کی خدمت میں بھیجی، اور عریضہ کے ذریعہ درخواست کی کہ ان کو حضرت ملاحظہ فرمالیں اور جہاں محسوس فرمائیں کہ ہم لوگوں سے اس کام میں اور خاصکر "دستور" میں کوئی غلطی ہوئی ہے اس کی نشاندہی فرمادیں، میں کوشش کروں گا کہ اس کی اصلاح و تصحیح ہوجائے ــــــ ساتھ ہی میں نے لکھا کہ اگر حضرت ارشاد فرمائیں تو میں اس مقصد کے لیے حاضر خدمت ہوجاؤں ــــــ (اور فی الواقع اس خط سے میری نیت اور غرض یہ تھی کہ اگر حضرت تھانوی تصویب فرمادیں تو ہمارے لیے ایک سند ہوجائے۔)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ میرا عقیدت و نیازمندی کا تعلق تھا اور حضرت بہت زیادہ عنایت و شفقت فرماتے تھے ــــــ اپنے معمول کے مطابق حضرت نے میرے خط ہی پر مختصر جواب تحریر فرمایا جس کا حاصل یہ تھا کہ ــــــ میں نے دونوں چیزوں کو دیکھا کوئی خاص بات گرفت میں نہیں آئی جو آپ کو لکھوں، لیکن دل قبول نہیں کرتا۔ آپ جب بھی آئیں میرے لیے آپ کا آنا مسرت ہی کا باعث ہوگا لیکن اس مقصد کے لیے سفر کی زحمت نہ کی جائے ــــــ "(خط کشیدہ فقرہ" لیکن دل قبول نہیں کرتا" بعینہ حضرت کے الفاظ ہیں)۔

(باقی اگلے صفحہ پر) ــــــ

برصغیر کے اکابر علماء اہلحدیث میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ وغیرہ اُس دور کے قریباً تمام ہی اکابر علماء اہلحدیث کا حال بھی جہاں تک معلوم ہے یہی رہا کہ انھوں نے مودودی صاحب اور ان کی جماعت کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔

اس کے برعکس پورے برصغیر میں اکابر علمائے معتمدین میں سے (نہ علمائے اہلحدیث میں سے نہ علمائے احناف میں سے) کسی کے بارہ میں راقم سطور کو علم نہیں کہ انھوں نے ان کی دعوت کو قبول کیا ہو اور اپنے سابقہ دینی موقف اور تصوّر دین میں کوئی ترمیم و اصلاح کی ہو ———— یہی حال عام دیندار مسلمانوں کی غالب اکثریت کا ہے کہ انھوں نے بھی مودودی صاحب اور ان کی جماعت کی دعوت کو قبول نہیں کیا ہے ان کا جو عقیدہ جو مسلک جو دینی طرز عمل پہلے تھا اس میں انھوں نے مودودی صاحب کی اور جماعت اسلامی کی دعوت کی وجہ سے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ ان کا یہ طرز عمل خواہ اپنی فہم و بصیرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

پھر اس کے چند ہی روز بعد مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانویؒ کا خط مجھے ملا (جو حضرت کے قریبی عزیز اور خاص خدام میں سے تھے اور الحمد للہ ہیں) انھوں نے تحریر فرمایا تھا کہ آپ نے جماعت اسلامی کے اجتماع کی رُوداد اور اس کا دستور جو حضرت کی خدمت میں بھیجا تھا وہ حضرت نے دیکھنے اور اظہار رائے کیلیے مجھے عنایت فرما دیا تھا میں نے اس کو غور سے دیکھا مجھے تو اس میں بہت سی قابل اصلاح باتیں نظر آئیں، میں نے ان کو لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ اس کو میں آپ کو (محمد منظور نعمانی کو) بھیجدوں، چنانچہ بھیج رہا ہوں۔

اس میں مولانا جمیل احمد صاحب نے "دستور" پر اکثر وہ اعتراضات کیے تھے اور خطرات و خدشات ظاہر کیے تھے جو بعد میں معتمد اکابر علماء کی طرف سے کیے گئے، لیکن اُس زمانہ میں راقم سطور اُن کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا صرف تعبیر اور انداز تحریر کا فرق سمجھتا تھا، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف تعبیر کا فرق نہیں بلکہ طرز فکر اور عقیدہ کا

بقیہ

کی بنا پر ہو خواہ اپنے معتمد علماء کے اتباع میں —— تو مولانا مودودی صاحب کے مندرجہ بالا بیان کے مطابق امت کے ان تمام عوام و خواص نے وہ پوزیشن اختیار کرلی ہے جو قوم یہود نے اختیار کر لی تھی —— انا للہ وانا الیہ راجعون ہ

میرا خیال ہے کہ مودودی صاحب کے اس بیان کا مقصد دعوت قبول نہ کرنے والوں کی تکفیر نہیں ہے، جو مرزا غلام احمد کے متبعین میں سے قادیانی شاخ کا موقف ہے بلکہ غالباً وہ ان کو تکفیر کے بغیر یہود کی طرح اللہ کی رضا و رحمت سے محروم مغضوب علیہم مستحق غضب الٰہی قرار دے رہے ہیں۔ یہ تریب قریب وہ موقف ہے جو مرزا غلام احمد اور اُن کی دعوت کو قبول نہ کرنے والے مسلمانوں کے بارہ میں قادیانیوں کی لاہوری شاخ کا ہے جس کے امیر مولوی محمد علی لاہوری ایم اے تھے۔

یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو خود راقم سطور کو پیش آیا تھا۔ ۱۹۴۴ء کے اواخر یا ۱۹۴۵ء کے اوائل میں ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ اس عاجز نے دہلی سے پشاور بلکہ کوہاٹ تک کا سفر کیا تھا۔ اس سفر میں جالندھر اور اُس کے بعض ملحقہ قصبات میں بھی کچھ قیام ہوا تھا —— اب ٹھیک یاد نہیں کہ خاص جالندھر شہر یا اس کے کسی قصبہ کے قیام میں ایک دن جماعت اسلامی کے کچھ حضرات مجھ سے ملنے آئے۔ میں اُن حضرات کے ساتھ الگ بیٹھ گیا۔ (جیسا کہ سرگزشت سے معلوم ہو چکا ہے میں ۱۹۴۲ء میں "جماعت" سے علاحدگی اختیار کر چکا تھا اور میں اس زمانہ میں اس موضوع پر کسی سے بات کرنے سے بھی گریز کرتا تھا) ان حضرات نے جماعت اسلامی سے میرے قطع ہی سے متعلق مجھ سے گفتگو کرنی چاہی، میں نے پہلوتہی کا رویہ اختیار کیا، ان حضرات نے اصرار کیا، لیکن میں اپنے رویہ پر قائم رہا —— آخر میں اُن میں سے ایک صاحب بہت غصہ اور طیش میں آگئے اور فرمایا اب ہم صاف کہتے

ہیں کہ آپ مرتد ہو گئے ہو ہم دعوت دیتے ہیں کہ توبہ کر کے پھر اسلام میں آجاؤ !

اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بڑا فضل ہوا کہ اُس وقت مجھے غصہ بالکل نہیں آیا ——— اب یاد نہیں کہ میں نے اُن سے کیا کہا ——— اُن کے علاوہ جو دوسرے ۳-۴ اُن کے ساتھی تھے میں نے محسوس کیا کہ وہ بیچارے اپنے اس ساتھی کی اس بات سے بہت پریشان اور نادم ہیں، انھوں نے مجھ سے کچھ معذرت بھی کی اور رخصت ہو گئے ——— میں اُس وقت یہی سمجھا تھا کہ اس بیچارہ نے جو کچھ مجھ سے کہا (مولانا مودودی کے الفاظ میں) یہ اس کے "نو مسلمانہ جوش" اُس کے ساتھ "بے علمی" اور بات کرنے میں سلیقہ کی کمی ہی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس بیان کے سامنے آنے کے بعد شبہ ہوتا ہے کہ شاید اُس بیچارے نے مولانا مودودی صاحب کے اس بیان ہی سے یہ سمجھا ہو کہ جو شخص جماعت اسلامی میں شامل ہو کر الگ ہو گیا وہ اسلام ہی سے نکل گیا ——— اور یہودی اور مرتد ہو گیا ——— اور اُس نے "مجاہدانہ" صاف گوئی سے کام لیا ہو۔

امت میں اسی طرح فرقے بنتے ہیں

واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی نے اپنی تحریروں میں بار بار یہ دعویٰ کیا ہے اور پوری قوت کے ساتھ اپنے متبعین کے ذہن نشین کرایا ہے کہ اُن کے علاوہ جو دینی حلقے یا دین کی خدمت کرنے والے ہیں اُن کے پاس بس دین کا کوئی جز یا کچھ اجزا ہیں، وہ بس انہی کو لیے ہوئے ہیں، "کل دین" اور "خالص حق" کی دعوت لیکر وہی کھڑے ہوئے ہیں ——— پھر ۴۴ئہ والے اس بیان میں جو اوپر درج کیا گیا انھوں نے ایک قدم آگے بڑھا کے یہ بھی حکم لگا دیا کہ ہماری یہ دعوت دنیا کے جس حصہ میں بھی جن مسلمانوں کو پہنچ جائے اور وہ اس کو قبول نہ کریں تو ان کی پوزیشن وہ ہے جو قوم یہود کی تھی ——— یہی وہ باتیں ہیں جنھوں نے جماعت اسلامی کو واقعہ میں ایک "فرقہ" بنا

دیا ہے ـــــــ کوئی فرقہ اس اعلان کے ساتھ نہیں بنا کرتا کہ وہ "فرقہ" بن رہا ہے بلکہ اس کے مخصوص دینی نظریات اور دعوے ہی اس کو "فرقہ" بنا دیتے ہیں ـــــــ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ کل دین اور خالص حق صرف آپ کے پاس ہے اور آپ ہی اس کی دعوت لیکر کھڑے ہوئے ہیں، آپ کے علاوہ دوسرے مسلمانوں اور اکابر علماء و مشائخ کے بھی پاس جو دین ہے وہ جزوی ہے یا اس میں باطل کی آمیزش ہے اور اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ کی دعوت کو قبول کریں، اگر قبول نہ کریں گے تو اُن کی پوزیشن وہ ہوگی جو قوم یہود کی تھی ـــــــ تو آپ اپنے اور باقی امت مسلمہ کے درمیان تفریق و امتیاز کی لکیر کھینچ دیتے ہیں اور اس طرح آپ سے آپ ایک مستقل فرقہ بن جاتے ہیں، اگرچہ آپ ہزار بار اعلان کریں کہ ہم فرقہ نہیں ہیں اور ہم فرقہ بندی کے مخالف ہیں

قادیانیوں کی لاہوری شاخ کی مشہور و ممتاز شخصیت خواجہ کمال الدین نے غالباً یورپ کے کسی ملک کی کانفرنس میں تقریر کی تھی یا مقالہ پڑھا تھا، اس کا عنوان تھا "اسلام میں کوئی فرقہ نہیں" اس کا اردو ترجمہ بھی کتابی شکل میں چھپا تھا، اس عاجز نے اب سے قریباً پچاس سال پہلے پڑھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے دوسرے صاحب مطالعہ حضرات کی نظر سے بھی گزرا ہوگا ـــــــ اُس میں انھوں نے اپنی جماعت (قادیانیوں کی لاہوری شاخ) کے متعلق بھی یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کوئی "فرقہ" نہیں ہے۔ ـــــ لیکن کیا اس اعلان سے اس کے فرقہ ہونے کی حیثیت ختم ہو گئی ـــــــ

مجھے معلوم ہے کہ خود مولانا مودودی نے اور جماعت کے دوسرے حضرات نے بھی بار بار لکھا ہے کہ "جماعت اسلامی" فرقہ نہیں ہے، لیکن مذکورہ بالا مخصوص نظریات اور دعووں کے باوجود یہ لکھنا خواجہ کمال الدین کے اعلان سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔

جماعت اسلامی کے بعض ترجمان حضرات نے "فرقہ" نہ ہونے کی دلیل کے طور پر یہ بات بھی بار بار لکھی ہے کہ ہم تو جماعت سے تعلق نہ رکھنے والے ہر مسلک کے مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں ہم "فرقہ" کیسے ہو سکتے ہیں ——— راقم سطور عرض کرتا ہے کہ یہ طرزِ عمل کہ ہر خیال اور ہر مسلک والوں کے پیچھے نماز پڑھ لی جائے (اگرچہ معلوم ہو کہ اس کا عقیدۂ توحید بھی صحیح نہیں ہے ——— قبر پرست یا تعزیہ پرست ہے یا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی کل دین اور خالص حق کی دعوت پہنچ جانے کے بعد بھی اس نے اس کو قبول نہ کر کے بلکہ رد کر کے وہ پوزیشن اختیار کر لی ہے جو قوم یہود نے اختیار کی تھی) "فرقہ" نہ ہونے کی دلیل تو کسی منطق کی رو سے نہیں ہو سکتی۔ ہاں اس بات کی علامت ضرور ہو سکتی ہے کہ نماز کو بھی "سیاست" بنا لیا گیا ہے وہ مولانا مودودی صاحب کے پیچھے بھی پڑھی جا سکتی ہے اور مسٹر جناح جیسے کسی آغا خانی یا اسماعیلی کے پیچھے بھی علیٰ ہذا کسی تعزیہ دار یا قبر پرست کے پیچھے بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ دینداری نہیں دوکانداری ہے ——— نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

آخر میں یہ عاجز محترم مولانا مودودی اور ان کے خاص رفقا اور ہندوستان و پاکستان کے جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے اپنے قدیم تعلق ہی کی بنا پر عرض کرتا ہے کہ اس تحریر میں راقم سطور نے "دین کی بنیادی اصطلاحات کی نئی سیاسی تشریح" اور "دین میں حکمت عملی" کے فلسفہ اور غلافِ کعبہ کی گشتی نمائش سے متعلق اور آخر میں ۴۴ء والے مندرجہ بالا بیان کے بارہ میں جو کچھ عرض کیا ہے، اس پر غور فرمائیں ——— اپنی موت کے یقین اور آخرت کے محاسبہ کو پیش نظر رکھ کر غور فرمائیں پھر اگر محسوس ہو کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ معاندانہ بہتان طرازی یا صرف غلط فہمی نہیں ہے بلکہ حقیقت اور واقع کے مطابق ہے اور فتنہ اور ضلال کے جن

خطرات کی نشاندہی کی گئی ہے وہ صرف وساوس واوہام نہیں ہیں بلکہ ان غلطیوں کے فطری اور لازمی نتائج ہیں تو رجوع کر کے اصلاح و تصحیح اور ضلال اور فتنہ سے خاصکر اپنے متبعین کی حفاظت کا فریضہ ادا فرمائیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا و محبت حاصل کریں ——— ان اللہ یُحِبُّ التوّابین ۰

غالباً مولانا مودودی اور اُن کے بہت سے رفقا کے علم میں بھی یہ معروف واقعہ ہوگا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو از خود یا کسی معترض اور ناقد کے اعتراض کے نتیجہ میں ایک زمانہ میں یہ احساس ہوا کہ اللہ کی توفیق سے میں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، ان میں مجھ سے غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی، تو ایک اچھے صاحب نظر اور وسیع المطالعہ عالم دین (مولانا حبیب احمد کیرانوی) کو، جو فطری طور پر سخت ناقد اور نکتہ چیں تھے، حضرت مولانا نے اپنی ذات سے معقول تنخواہ دیکر اسی کام کے لیے مقرر کیا کہ وہ مولانا کی تصانیف کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں اور جہاں کوئی غلطی محسوس کریں اس کی نشاندہی کریں ——— طویل مدت تک یہ کام ہوتا رہا اور اس کے نتیجہ میں تحقیق اور تبادلہ خیالات کے بعد حضرت تھانویؒ نے بہت سے مسائل میں اپنی سابقہ رائے اور تحقیق سے رجوع فرمایا اور اپنی تصانیف اور فتاوی میں بیسیوں جگہ تبدیلی یا ترمیم فرمائی اور اس کا اعلان ضروری سمجھا۔ پھر اس سب کو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں مرتب کرا دیا جو "ترجیح الراجح" کے نام سے شائع ہو چکی ہے ——— بیشک حق پرستی اور خدا ترسی کا راستہ یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وّ ارزقنا اتباعہ، وارنا الباطل باطلاً وّ ارزقنا اجتنابہ

اضافہ

مولانا مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے مخلصین کی خدمت میں

جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے یہ عاجز جماعت کی تاسیس وتشکیل اور اس کی ابتدائی دعوتی اور تعمیری سرگرمیوں میں مولانا مودودی مرحوم کا اولین شریک و رفیق تھا اور مولانا کے بعد اس میں سب سے بڑا حصہ اس ناچیز ہی کا تھا جس کی کچھ تفصیل گزشتہ اوراق میں لکھی ہوئی سرگزشت میں بھی ذکر کی جا چکی ہے —— مجھے یقین ہے کہ میں مولانا مرحوم اور جماعت کے ساتھ تعلق کے اس فیصلہ اور عمل میں بتوفیق اللہ تعالیٰ مخلص تھا، کسی نفسانی غرض اور دنیوی مفاد کا تو اس وقت احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا، بس دین کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد کے ذریعہ اپنی آخرت سنوارنے ہی کی نیت تھی —— تو جس طرح اس عاجز کو اپنے بارہ میں یہ یقین ہے —— اسی طرح آپ حضرات کے بارہ میں بھی یہی نیک گمان ہے۔ اسی گمان کی بنا پر آپ ہی حضرات اور خود مولانا مرحوم کو پیش نظر رکھ کر یہ صفحات لکھے گئے تھے اور بعض باتیں خاص طور سے مولانا ہی کو مخاطب کر کے عرض کی گئی تھیں —— لیکن اللہ کی مشیت اور اس کی قضا و قدر کا فیصلہ کہ اس کی طباعت

واشاعت سے پہلے ہی اُن کا وقت موعود آگیا اور وہ ہماری اس دنیا میں نہیں رہے، اپنے مالک کے حضور میں پہنچ گئے جہاں ہم سب کو بھی حاضر ہونا ہے، اب ہم پر ان کا یہی حق ہے کہ ان کے لیے اور اپنے لیے بھی ہر قسم کی تقصیرات کی معافی اور مغفرت ورحمت کی اپنے اور اُن کے رب کریم سے دعا کیا کریں ـــــ اللہ تعالیٰ اس حق کے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اب مولانا مرحوم کے بجائے ان خاص معروضات کے مخاطب جماعت اسلامی کے وہ عمائد واکابر ہیں جن پر جماعت کے تمام متعلقین کے دین کی ذمہ داری ہے، اور بلاشبہ یہ بڑی بھاری ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ وہ اس ذمہ داری اور مسئولیت کی اہمیت اور سنگینی کو محسوس فرمائیں۔

یہ عاجز جانتا ہے اور عمر بھر کا ذاتی تجربہ بھی ہے کہ کسی دعوت اور مسلک کو اپنا لینے اور کسی خاص شخصیت یا جماعتی نظام اور حلقہ سے باضابطہ وابستہ ہو جانے کے بعد اس کی غلطی کو یا اس کے بارہ میں اپنی رائے کی غلطی کو محسوس کرنا اور اس احساس کے مطابق فیصلہ اور عملی اقدام کرنا بیحد مشکل کام ہوتا ہے اور غیر معمولی عزیمت کو چاہتا ہے اور یہ خدا پرستی اور اخلاص کا بڑا سخت امتحان ہوتا ہے۔

ماضی قریب کی بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنے ہی زمانے کی دو مثالیں ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں

مرزا غلام احمد قادیانی نے اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دوسرے مذاہب خاص کر عیسائیت اور ہندو دھرم کے مقابلہ میں اس کی حقانیت اور برتری ثابت کرنے اور دنیا بھر میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے نام پر ایک خاص مدعیانہ

انداز میں ایک کام شروع کیا تو اس کے لیے ابتدا میں ایک جماعت بنائی، اس دور میں مرزا صاحب کی طرف سے ایسی باتیں ظہور میں نہیں آئی تھیں جو مسلمانوں کے لیے موجب وحشت ہوتیں اور جن سے سمجھا جا سکتا کہ یہ آدمی دین کے معاملہ میں قابل اعتبار نہیں ہے، اس لیے اُس زمانے میں بہت سے اچھے اچھے اصحاب علم و دانش مرزا صاحب کی دعوت پر لبیک کہہ کر اُن کے ہاتھ پر بعیت کر کے اُن کی جماعت میں شامل ہو گئے، اور مرزا صاحب سے انھوں نے پورا تعاون کیا بلکہ اس سلسلہ میں بڑی قربانیاں دیں ــــــ پھر ایک وقت آیا کہ مرزا صاحب نے اپنے بارے میں نئے نئے دعوے کرنے شروع کیے جن کی وجہ سے علمائے کرام اُن کے خلاف اظہار رائے پر مجبور ہوئے اور عام مسلمانوں میں بھی اُن سے وحشت بلکہ بیزاری پیدا ہوئی، لیکن اُن کے "مخلص مبایعین" کا حلقہ ان سب دعووں کو تدریجاً ہضم کرتا رہا بلکہ کہنا چاہیئے کہ ان پر ایمان لاتا رہا ــــــ پھر اللہ تعالیٰ نے مرزا صاحب سے بعض ایسی سفیہانہ غلطیاں صادر کرائیں جن سے دو اور دو چار کی طرح اور روز روشن میں نصف النہار کے سورج کی طرح یہ بات سب کی آنکھوں کے سامنے آئی کہ یہ آدمی راست باز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ پر افترا کرنے میں بھی بڑا جری اور بیباک ہے ــــــ جس کی نہایت واضح اور ناقابل تاویل مثال احمدی بیگم کا شرمناک اور رسوا کن قصہ اور اس سلسلہ میں مرزا صاحب کی بار بار کی پیشین گوئیاں جو خدا کے الہام کا حوالہ دے کر انھوں نے کی تھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو غلط ثابت کر کے ہر آنکھوں والے کو دکھلا دیا کہ یہ شخص الہام کے دعوے میں مفتری ہے ۔اس طرح کی اور بھی متعدد مثالیں ہیں ــــــ لیکن اللہ کی شان کہ مرزا صاحب کے "مخلص مبایعین" میں سے مولوی محمد علی لاہوری ایم اے اور خواجہ کمال الدین جیسے اصحاب علم و دانش کو اِن پیشین گوئیوں کا کذب و افترا علی اللہ ثابت ہو جانے کے بعد بھی توفیق نہیں

لی کہ وہ بیعت توڑ کے اُن کی جماعت کے حلقہ سے باہر آجاتے، حالانکہ جو شخص اِن دونوں صاحبوں (مولوی محمد علی لاہوری اور خواجہ کمال الدین) کے حالات سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ مرزا صاحب کے ساتھ وابستہ رہنے میں اُن کا کوئی دنیوی نفع نہیں تھا، خسارہ اور نقصان ہی تھا ـــــ اصل بات وہی ہے کہ کسی خاص مسلک اور حلقہ سے وابستہ ہو جانے کے بعد اس کی غلطی یا اس کے بارہ میں اپنی رائے کی غلطی محسوس کرکے اس کے مطابق فیصلہ اور عملی اقدام کرنا بہت بڑا مجاہدہ اور بڑی غیر معمولی عزیمت کو چاہتا ہے اور یہ عزیمت انہی بندگان خدا کو نصیب ہوتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے عطا فرمائے۔

دوسری مثال "خاکسار تحریک" ہے یہ تحریک اب سے صرف ۵۰ ـ ۴۵ سال پہلے ہمارے ہی ملک میں پنجاب سے اٹھی تھی، اس کے بانی اور قائد و علمبردار ایک صاحب "علامہ عنایت اللہ مشرقی" تھے۔ ان کا دعویٰ اور نعرہ جس پر تحریک کی بنیاد تھی یہ تھا کہ ابتک کے سارے عالم اور مولوی اسلام، ایمان اور عمل صالح کی قرآنی دعوت کا جو مطلب سمجھتے اور بیان کرتے رہے ہیں وہ غلط اور بالکل غلط ہے، صحیح وہ ہے جو علامہ نے خود سمجھا ہے اور اپنی تصانیف "تذکرہ" وغیرہ میں پیش کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ بس مادی حیثیت سے طاقتور بنو، خالص عسکری زندگی اختیار کرو اور اس کے ذریعہ دنیوی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرو، جیسا کہ آج کی یورپین اقوام کا حال ہے ـ بس یہی اسلام، ایمان اور عمل صالح والی زندگی ہے۔ وہ برملا کہتے اور لکھتے تھے کہ فی زمانناً اصلی مومنین صالحین انگریز وغیرہ یورپین اقوام ہیں جو اپنی طاقت سے دنیا کے بڑے حصہ پر حکمراں ہیں ـــــ مسلمانوں خاصکر نوجوانوں سے وہ کہتے تھے کہ سپاہیوں کی سی خاکی وردی پہنو، بیلچہ ہاتھ میں رکھو، اور اجتماعی قواعد پریڈ

کیا کرو ــــــ بڑے بڑے شہروں میں ان خاکساروں کے کیمپ لگتے اور عسکریت کے مظاہرے ہوتے تھے اور نہایت ناعاقبت اندیشانہ انداز میں مسلمانوں میں جنگجویانہ ذہنیت پیدا کی جا رہی تھی۔ بیچارے عام مسلمان ان مظاہروں سے مسحور ہوتے اور سمجھتے تھے کہ علامہ مشرقی کی یہ خاکسار فوج ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کر دے گی۔

یہ تحریک دینی حیثیت سے اور کتاب و سنت کی رو سے جتنی غلط اور عقل و دانش کے لحاظ سے جس قدر احمقانہ اور مہمل تھی افسوس ہے کہ نادان مسلم عوام اور خاصکر نوجوانوں کے لیے (جن پر جذباتیت کا غلبہ تھا) اس میں اتنی ہی غیر معمولی کشش تھی، آندھی اور طوفان کی رفتار سے اُس وقت اسلامی ہند پر یہ تحریک چھا گئی تھی، ایسی فضا بن گئی تھی کہ علامہ مشرقی یا خاکسار تحریک کے خلاف بولنا یا لکھنا اپنے کو خطرہ میں ڈالنا تھا۔ اس میں اُس وقت کے خاص سیاسی حالات کو بھی کچھ دخل تھا۔

اس تحریک کے انتہائی عروج کے اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے راقم سطور نے قریباً سوا سو صفحہ کا ایک مضمون "خاکسار تحریک دین اور سیاست کی روشنی میں" کے عنوان سے لکھا تھا جو الفرقان کے ایک ہی شمارہ میں شائع ہوا تھا، پھر وہ اسی نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوا، رفیق محترم مولانا علی میاں نے اُس کتابی اڈیشن کے لیے نہایت موثر فاضلانہ مقدمہ لکھا تھا، اور آخر میں خاتمہ کلام کے طور پر "خاکسار تحریک" اور علامہ مشرقی سے متعلق مرحوم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ایک مضمون شامل کیا گیا تھا جو اس موضوع پر ان کا بہترین مضمون تھا۔ (یہ جماعت اسلامی کی تاسیس سے قریباً دو سال پہلے کی بات ہے)۔
اس کتاب کو پڑھنے کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات سامنے آجاتی تھی کہ

علامہ مشرقی جس چیز کو اسلام کے نام سے پیش کر رہے ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا اور قرآن کا پیش کیا ہوا اسلام نہیں بلکہ جرمنی کے ہٹلر اور اٹلی کے موسولینی کا "دین" ہے اور ان کی تحریک سیاسی حیثیت سے بھی مسلمانان ہند کے لیے تباہ کن ہے اور خدا نکردہ اس کے نتیجہ میں اسلامیان ہند کسی بہت بڑے انجام سے دوچار ہو سکتے ہیں۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ میری وہ تحریر (اللہ تعالیٰ کی توفیق سے) استدلال کی قوت، بیان کی وضاحت اور تاثیر کے لحاظ سے میری ساری تحریروں میں ممتاز تھی اور مولانا علی میاں اور مولانا مودودی کی تحریروں کے شامل ہو جانے سے وہ کتاب بہت ہی موثر ہو گئی تھی —— متعدد اصحاب نظر نے اس کو پڑھ کر یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جو "خاکسار" اس کو پڑھے گا اگر اس میں کچھ بھی سمجھ اور صلاحیت ہوگی تو علامہ مشرقی اور ان کی تحریک سے قطع تعلق پر مجبور ہو جائے گا —— لیکن جہاں تک یاد ہے اس وقت مجھے دوچار کے بارہ میں بھی معلوم نہیں ہوا کہ انھوں نے اس کو پڑھ کر ایسا فیصلہ کیا ہو۔

بہر حال قادیانیت کی طرح خاکسار تحریک کا تجربہ بھی یہی ہے کہ جو شخص اس سے باضابطہ وابستہ ہو گیا، اس نے خاکی وردی پہن لی اور بیلچہ ہاتھ میں لے لیا تو پھر اس کو اپنی غلطی محسوس کرنے کی اور بازگشت کی توفیق شاذ و نادر ہی ملی —— پھر اللہ نے ایسا کیا کہ تحریک گویا خودکشی کر کے خود ختم اور پھر دفن ہو گئی ——

"وکفی اللہ المومنین القتال۰"

ؔ جیسا کہ عرض کیا گیا یہ تحریک آندھی اور طوفان کی رفتار سے بڑھی تھی، علما کے فتوے، مقررین کی تقریریں، "ترجمان القرآن" اور "الفرقان" جیسے دینی رسائل کے مضامین اور اس طرح کی ساری

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہاں قادیانیت اور خاکسار تحریک کے ذکر سے ہرگز کسی کو یہ وسوسہ نہ ہو کہ راقم سطور کے نزدیک جماعت اسلامی اور اس کی تحریک، قادیانیت اور خاکسار تحریک کے درجہ کی گمراہی ہے ـــــــ یہ عاجز اس طرح کے غلو سے اللہ کی پناہ چاہتا ہے ـــــــ جیسا کہ ظاہر ہے ان دونوں جماعتوں اور تحریکوں کا ذکر یہاں اس واقعہ اور تجربے کی چشم دید مثال اور شہادت ہی کے طور پر کیا گیا ہے کہ کسی خاص دعوت و مسلک اور کسی مخصوص نظام جماعت سے باضابطہ وابستگی کے بعد (اور مولانا مودودی مرحوم کے خاص الفاظ میں اپنی گردن میں اس کا قلادہ ڈال لینے کے بعد) اس کی غلطی کو محسوس کرنا اور اس احساس اور ادراک کے مطابق فیصلہ اور عملی اقدام کرنا بڑا سخت مجاہدہ اور بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے اور بڑی بے لاگ خدا پرستی اور غیر معمولی عزیمت کو چاہتا ہے، راقم سطور کو خود بھی اس کا تجربہ ہے بقول جگر مرادآبادی مرحوم

"اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اصلاحی کوششیں مسلم عوام اور خاصکر نوجوانوں کو اس غلط تحریک سے روکنے میں بہت ہی کم اثر انداز ہوئی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ظہور میں آیا کہ خود علامہ مشرقی ہی کے ناعاقبت اندیشانہ رویہ نے اپنے اس رواں دواں جہاز کو سمندر میں ڈبو دیا ـــــ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی، پنجاب میں سر سکندر حیات خاں کی وزارت تھی، علامہ اور ان کی فوج نے ایک مرحلہ پر حکومت سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا، ایک موقعہ پر بیلچوں سے پولیس والوں پر حملہ آور ہو گئے، سر سکندر حیات خاں نے پولیس والوں کو پوری طاقت استعمال کرنے کا حکم دیدیا، پھر انھوں نے بڑی بیدردی سے خاکساروں کو گولیوں کا نشانہ بنایا، بس لاہور کے اس تصادم اور ٹکراؤ کے نتیجہ میں وہ تحریک جو بظاہر پورے ملک پر چھائی ہوئی تھی پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئی اور ایسی ختم ہوئی کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد لوگ اس کو بالکل بھول گئے۔

لیکن الحمدللہ جماعت اسلامی کی تاریخ اس لحاظ سے ایسی تاریک اور مایوس کن نہیں ہے بلکہ بڑی تابناک اور اچھی امیدوں کا بڑا سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ قادیانیت اور خاکسار تحریک کے برعکس یہاں کا حال یہ ہے کہ ایسے حضرات کی اچھی خاصی تعداد ہے جنھوں نے مولانا مودودی کی دعوت پر پورے اخلاص کے ساتھ لبیک کہہ کے جماعت کے ساتھ وابستگی اختیار کی اور اس کی خدمت و تعمیر میں بھرپور حصہ لیا اور اپنے علمی و عملی امتیاز اور جماعت کے کام میں سرگرمی اور اس کی راہ میں قربانی کے لحاظ سے ان کو جماعت ہی میں بلکہ جماعت کی صف اول میں بلند ترین مقام حاصل تھا، ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جن کو مولانا مودودی نے اپنی عدم موجودگی کے مختلف مواقع پر اپنی جگہ جماعت کا امیر نامزد کیا تھا[1] ——— لیکن جب کسی مرحلہ پر یہ بات کھل کر ان کے سامنے آگئی اور ان کو یقین ہو گیا کہ مودودی صاحب اب غلط راستہ پر جارہے ہیں اور جماعت بھی اُن کے ساتھ اسی راستہ پر چل رہی ہے اور اصلاح کے لیے اور صحیح راستہ پر آنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں تو انھوں نے موصوف سے اور "جماعت" سے تعلق منقطع کر لینا "شہادت حق" کا تقاضا اور اپنا دینی فریضہ سمجھا۔ اور اللہ کی توفیق سے یہ نہایت کڑوا گھونٹ پی لیا۔ اس کی مثال میں جماعت اسلامی پاکستان کے اکابر و خواص میں سے مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا عبدالغفار حسن (حال استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) غازی عبدالجبار صاحب اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جیسے حضرات کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اور ہندوستان کی جماعت اسلامی کے ممتاز ارکان میں مولانا وحیدالدین خانصاحب (مدیر الرسالہ دہلی) اور مولانا حکیم ابوالحسن عبیداللہ خاں صاحب رحمانی (مقیم کشمیر) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہ سب وہ حضرات ہیں جو طویل

---

[1] مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، غازی عبدالجبار صاحب کو مختلف موقعوں پر اپنی جگہ امیر بنایا تھا۔

مدت تک جماعت اسلامی کے صف اول کے ارکان اور اس کے سرگرم داعی بلکہ قائد ورہنما رہے تھے۔

ان حضرات کے علاوہ خود اس عاجز کی اس سلسلہ کی سرگزشت آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں ۔ اسی کے ضمن میں مولانا سید محمد جعفر ندوی پھلواروی کے جماعت کے ساتھ تعلق اور پھر قطع تعلق کا ذکر بھی آچکا ہے۔ موصوف بھی جماعت کی تاسیس میں شریک اس کے بانیوں اور "السابقون الاولون" میں سے تھے۔ اور ملک کے ایک پورے منطقہ کے لیے نائب امیر بھی نامزد کیے گئے تھے۔ اسی کے ساتھ قمر الدین خاں صاحب ایم اے علیگ کے تعلق اور قطع تعلق کا ذکر بھی سرگزشت کے ضمن میں آچکا ہے۔ یہ بھی جماعت کی تاسیس میں شریک، اس کے بڑے پرجوش کارکن اور عہدہ کے لحاظ سے جماعت کے پہلے قیم تھے۔ —— رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری بھی جماعت کے صرف رکن نہیں بلکہ اس کے اکابر اور رہنماؤں میں سے تھے۔ سرگزشت کے ضمن میں مولانا بختیاری کے بارہ میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ پورے جنوبی ہند کے لیے وہ جماعت کے نائب امیر بنائے گئے تھے۔ ان دونوں حضرات کی سرگزشت بھی یہی ہے کہ وہ ایک مدت کے بعد جب اس نتیجہ پر پہونچے کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنے میں ہم سے غلطی ہوئی اور اس میں دینی نفع نہیں خسارہ ہے تو قطع تعلق کا فیصلہ کر لیا۔ جو اس وقت ان حضرات کے لیے یقیناً بڑا ہی کڑوا گھونٹ تھا۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے حضرات ہیں جو جماعت اسلامی سے وابستہ تھے، مدت تک وابستہ رہے، اور پھر دین ہی کی بنیاد پر انھوں نے اپنے کو الگ کر لیا۔[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن راقم سطور نے یہاں صرف انہی حضرات کا ذکر مناسب سمجھا ہے جو جماعت کے قائدین اور رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے بلکہ ان میں سے اکثر کے متعلق واقفین جانتے ہیں کہ مولانا مودودی صاحب کے علاوہ جماعت میں کوئی دوسری شخصیت ان کے درجہ کی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ نہ ہندوستان میں نہ پاکستان میں —— اس موقع پر خود مولانا مودودی کی ایک شہادت کا یاد دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جماعت اسلامی کے بالکل ابتدائی دور میں جن اہل علم حضرات کی طرف سے شدت کے ساتھ اختلاف کا اظہار کیا گیا اُن میں ایک مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم بھی تھے، اس سلسلہ کی ان کی اور بعض دوسرے اکابر اہل علم کی بھی تحریریں ناظرین کو یہ تاثر دیتی تھیں کہ مودودی صاحب جس طرف جا رہے ہیں وہ زیغ وضلال اور فتنہ کا راستہ ہے —— تو اسی زمانہ میں مولانا مودودی نے اپنے رفقائے جماعت میں سے اس عاجز راقم سطور، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری مولانا سید جعفر صاحب پھلواروی کا نام بنام ذکر کر کے، گویا اپنی صفائی میں تحریر فرمایا تھا کہ

> "ان میں سے کون ایسا ہے جس کے متعلق کوئی اللہ کا بندہ، اللہ کو سمیع وبصیر سمجھتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ کبھی اہل زیغ وضلال میں سے رہے ہیں یا فتنے کی طرف کبھی ان کا میلان رہا ہے یا علمی وعملی بدراہیوں میں وہ بھٹکتے رہے ہیں۔ طبقہ اولیٰ میں نہ سہی طبقہ ثانیہ میں تو شاید ان لوگوں کا شمار ہندوستان کے بہترین اشخاص میں ہو سکتا ہے"۔
>
> (ترجمان القرآن جنوری فروری ۱۹۴۱ء صـ ۱۳)

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ؎ سرگزشت میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ جس زمانہ میں جماعت اسلامی پاکستان کے اکابر اور ارباب حل وعقد میں سے مولانا اصلاحی، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب وغیرہ نے قطع تعلق کیا تھا اُس وقت قریباً ۔ ارکان نے استعفا دیا تھا۔

لیکن اللہ کی شان جیسا کہ معلوم ہو چکا ان سب ہی حضرات نے مختلف اوقات میں جماعت سے قطع تعلق کیا اور دین ہی کی بنیاد پر کیا اور ان میں سے ایک بھی مودودی صاحب کے ساتھ نہیں رہا ـــــ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی کے مخلصین کے لیے یہ بات بہت سوچنے کی ہے۔ فھل من مدکر؟

الغرض جماعت اسلامی کی تاریخ نہ صرف قادیانیت اور خاکسار تحریک کے مقابلہ میں بلکہ جہاں تک اپنا مطالعہ ہے قریبًا ۱۳-۱۴ سو سال کی مدت میں امت مسلمہ میں اٹھنے والی ساری تحریکوں اور فرقوں کے مقابلہ میں اس لحاظ سے بہت ہی ممتاز بلکہ منفرد ہے کہ جو حضرات اس کی تاسیس اور پھر تعمیر و خدمت میں پوری سرگرمی سے شریک رہے تھے اور جن کی قربانیاں اس راہ میں کسی دوسرے سے کم نہیں تھیں، وہ "السابقون الاولون" اور جماعت کے اہل حل وعقد میں سے تھے اور جن کی دینی بصیرت اور حق پرستی و تقویٰ شعاری جماعت کے اندر اور باہر بھی مسلّم و معروف تھی اور جماعت کے ساتھ جن کے تعلق کو جماعت کے برحق ہونے کی علامت اور دلیل سمجھا اور کہا جاتا تھا ان سب ہی نے مختلف اوقات میں جماعت سے قطع تعلق کیا اور کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے لیے جماعت سے وابستہ رہنے کا جواز نہیں سمجھا کیونکہ انھوں نے مودودی صاحب میں اور ان کے اثر سے پوری جماعت کے مزاج میں دینی لحاظ سے زیغ و انحراف محسوس کیا۔ ان میں سے بعض حضرات نے امکانی حد تک اصلاح حال کی کوشش اور اتمام حجت کر کے مایوس ہونے کے بعد یہ فیصلہ کیا[1]

---

[1] مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے (جو "جماعت اسلامی پاکستان" کے بلکہ اس کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین اور ممتاز رہنماؤں میں تھے اور ان کا ہفتہ وار "المنیر لائل پور" سالہا سال تک جماعت کا گویا

(باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال جماعت اسلامی کی اس تاریخ اور اس امتیاز کو پیش نظر رکھ کر ہی یہ عاجز جماعت سے تعلق رکھنے والے تمام مخلصین اور خاص کر اُس کے عمائد اور ذمہ داروں کی خدمت میں اپنی یہ معروضات پیش کر رہا ہے اور عرض کرتا ہے کہ اس سلسلۂ مضمون میں مولانا مودودی مرحوم کی جن چند متعین سنگین اور خطرناک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

آرگن اور سرگرم داعی رہا تھا) انھوں نے جماعت سے مستعفی ہونے سے پہلے اور اس کے بعد (۵۷ء اور ۵۸ء میں) جو مضامین "الفرقان" ہی میں مولانا مودودی صاحب اور جماعت کے غلط رویہ اور انحراف کے بارہ میں لکھے اُن سے اس سلسلہ کی پوری تفصیلات سامنے آجاتی ہیں ——— ان کے علاوہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا بھی ایک طویل مکتوب مئی ۵۸ء میں پاکستان کے بعض اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے بہت تفصیل سے لکھا تھا کہ انھوں نے اصلاح کی کیا کیا کوششیں کیں اور پھر کس طرح مایوس ہو کر جماعت سے مستعفی ہوئے (مولانا اصلاحی کا یہ مکتوب پاکستانی اخبارات ہی کے حوالہ سے نقل ہو کر "سہ روزہ مدینہ بجنور" کی ۵ رجون ۵۸ء کی اشاعت میں بھی شائع ہوا تھا) ———
ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تصنیف، "تحریک جماعت اسلامی ——— تحقیقی مطالعہ" اس سلسلہ کی سب سے اہم کتاب ہے ——— مولانا وحید الدین خاں صاحب کی "تعبیر کی غلطی" اور "دین کی سیاسی تعبیر" اس سلسلہ میں خاص طور سے قابل مطالعہ ہیں۔ مولانا حکیم عبید اللہ خاں صاحب مقیم کشمیر (قریباً ۲۰ سال تک "جماعت اسلامی" کے سرگرم داعی رہے، اس کے بعد جب انھوں نے مولانا مودودی صاحب اور ان کی پیروکار "جماعت اسلامی" میں زیغ وضلال اور صراط مستقیم سے انحراف محسوس کیا تو قطع تعلق کر لیا اور اظہار حقیقت و اتمام حجت کے لیے "اسلامی سیاست یا سیاسی اسلام" کے نام سے پورے تین سو صفحے کی کتاب لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے علاوہ کسی جماعت اور تحریک کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملے گی کہ اس کے صف اول کے رہنما اُس سے اس طرح الگ ہوئے ہوں۔

غلطیوں کے بارہ میں اس عاجز نے گفتگو کی ہے، خدارا اپنے کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں جوابدہ سمجھ کر غور فرمائیے کہ کیا دینی لحاظ سے ان کے سنگین اور خطرناک اور موجب فتنہ ہونے میں کوئی شک شبہ ہے۔

جو حضرات جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے ساتھ اس عاجز کے تعلق کی تاریخ سے واقف ہیں اُن کے علم میں ہوگا (اور خود راقم سطور نے "سرگزشت" میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے) کہ جماعت سے قطع تعلق کے بعد طویل مدت تک اس ناچیز کا حال یہ رہا کہ مودودی صاحب پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے میں چونکہ دیانت داری سے ان کو غلط فہمی پر مبنی سمجھتا تھا اس لیے خود ان کی طرف سے مدافعت اور جوابدہی کرتا تھا ——— جماعت سے میرے قطع تعلق کے قریباً آٹھ دس سال بعد کا ۱۳۵۱ھ کا واقعہ ہے، اُس زمانہ میں بعض حضرات کی طرف سے ایسی تحریریں شائع ہوئیں جن میں مودودی صاحب پر اعتراضات تھے تو میں نے ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ (اگست ۱۹۵۱ء) کے الفرقان میں مولانا موصوف کی طرف سے جوابدہی کی تھی اور صفائی پیش کی تھی۔

لیکن راقم سطور نے اس سلسلہ مضمون میں جن چند غلطیوں پر گفتگو کی ہے، میں غور و فکر کے بعد بھی ان کی کوئی تاویل اور کوئی توجیہ نہیں کر سکا میں اپنے خدا کے سامنے عرض کر سکوں گا کہ میں نے کتاب و سنت کی روشنی میں ان غلطیوں کو دین میں زیغ و ضلال اور فتنہ ہی سمجھا تھا ——— اور اسی لیے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ پوری وضاحت کے ساتھ اپنا مافی الضمیر آپ حضرات کے سامنے پیش کر دوں۔

اگرچہ جماعت کے مزاج سے واقفیت اور ذاتی تجربہ کی بنا پر قریب بہ یقین اندازہ ہے کہ جماعت کے اہل قلم کی طرف سے اس کا جواب نہیں، بلکہ

جوابات دیے جائیں گے، لیکن میں پیشگی عرض کروں گا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے جواب کے لیے نہیں لکھا بلکہ اپنی عمر کے پیش نظر موت کا وقت قریب سمجھ کر شہادت حق براءت ذمہ اور اصلاح کی امکانی کوشش کا فریضہ ادا کرنے ہی کی نیت سے لکھا ہے اس کے آگے معاملہ بس خدا کے سپرد ہے۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۚ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

مضامین کا اشاریہ اور عنوانات بقید صفحہ